جلد ۱۲ شمارہ ۲ فروری ۲۰۰۰ء شوال ۱۴۲۰ھ

# فہرست


| | | |
|---|---|---|
| اس شمارے میں | محمد بلال | ۲ |
| **شذرات** | | |
| مسلمان دین مساوات کو ماننے کے باوجود... | محمد بلال | ۴ |
| **قرآنیات** | | |
| البیان: البقرہ ۲: ۷۴-۸۲ (۱۳) | جاوید احمد غامدی | ۷ |
| **معارف نبوی** | | |
| غلبۂ اسلام — جنت کی چابی | طالب محسن | ۱۲ |
| **مناجات** | | |
| آغاز سفر پر اذکار | ساجد حمید | ۱۷ |
| **دین و دانش** | | |
| قانون سیاست (۲) | جاوید احمد غامدی | ۲۰ |
| خور و نوش میں حلت و حرمت (۱) | جاوید احمد غامدی | ۲۳ |
| غیر مسلم حکومت میں مسلم اقلیت کا دعوتی کردار (۲) | سید وصی مظہر ندوی | ۲۷ |
| **رفتہ و حاضر** | | |
| امام احمد بن حنبل | محمد ساجد خان خاکوانی | ۴۱ |
| انسانی عظمت و کردار کا پیکر | محمد رفیع مفتی | ۵۰ |
| **یسئلون** | | |
| متفرق سوالات | طالب محسن | ۵۳ |
| **وفیات** | | |
| ایک ''سعادت مند خادم'' کی رحلت | محمد بلال | ۵۸ |
| **خیال و خامہ** | | |
| غزل | جاوید احمد غامدی | ۷۱ |


www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

# اس شمارے میں

''دین ایک نظام ہے اور اس نظام کو ریاست کی سطح پر نافذ کرنا افضل ترین فرض ہے''۔ یہ اسلام کی ایک تعبیر ہے جو دور حاضر میں پیش کی گئی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اس تعبیر دین کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ مگر اس تعبیر کے قائل علما اور عام لوگوں میں اس طرز فکر کا ایک لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے ہاں ریاست کے مسائل، سب سے بڑے مسائل کی حیثیت اختیار کر گئے۔ ایسے علما کی تقریریں سنیں، تحریریں پڑھیں، سرگرمیاں دیکھیں تو ان کے اندر علم اور آخرت کے مسائل نمایاں نظر نہیں آتے۔ اسی طرح اس تعبیر پر مبنی جماعتوں سے وابستہ عام لوگ بھی سب سے زیادہ ریاست ہی کے ظاہری اور قانونی مسائل میں الجھے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک دفعہ ایک ایسے ہی آدمی نے مجھے اپنی جماعت میں شامل ہونے کی دعوت دی اور قائل کرنے کے لیے پہلے ملکی حالات کی خرابی بیان کی اور پھر حکمرانوں کے عیب گنوانے شروع کر دیے۔ حالانکہ دین کے سادہ مطالعہ سے معلوم ہو جاتا ہے کہ انسان کا اصل مسئلہ کسی ریاستی نظام کی تبدیلی نہیں، بلکہ اخروی کامیابی کا حصول ہے اور اسی طرح انسان کا سب سے بڑا دشمن کوئی سیکولر حکمران نہیں، بلکہ شیطان ہے۔

اس تعبیر دین پر تنقید کرنے والے علما نے کئی دلائل دیے۔ ان میں سے ایک دلیل یہ ہے کہ ہمارے اسلاف کی زندگی ان باتوں اور سرگرمیوں سے بالکل خالی ہے جو مذکورہ تعبیر دین کے قائل علما نے اختیار کر رکھی ہیں۔

اس وقت ''رفتہ و حاضر'' کے ذیل میں ہمارے اسلاف میں سے ایک بڑی علمی شخصیت امام احمد حنبل رحمہ اللہ پر دو تحریریں شائع کی گئی ہیں۔ ایک تحریر تفصیلی ہے اور ایک مختصر۔ ان تحریروں کے مطالعے سے یہ بات نکھر کر سامنے آئے کہ ریاست کی سطح پر غیر اسلامی امور موجود ہوں تو عالم دین کا صحیح کام یہ ہے کہ وہ کلمۂ حق بلند کرے، اس راہ میں پیش آنے والے مصائب کو برداشت کرے اور خود کو علم اور دعوت تک محدود رکھے نہ کہ ان غیر اسلامی امور کی اصلاح کے لیے علم اور دعوت کو بالائے طاق رکھ کر مسند اقتدار کے حصول کے لیے سرگرداں ہو جائے۔



www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

یہاں یہ بات پیش نظر رہے کہ امام احمد کے دور میں ریاست کی سطح پر شخصی استبداد، ملوکیت اور آمریت جیسے منکرات کا غلبہ تھا۔ حکمران اگرچہ بعض خوبیوں کے مالک تھے، مگر وہ اپنے حریفوں کے معاملے میں غیر انسانی تشدد حتیٰ کہ خون ریزی کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔ اس کے لیے وہ جس بے باکی اور سفاکی کا مظاہرہ کرتے تھے، اس کی تفصیل پڑھیں تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ کند چھری سے اپنے مخالف یا ناپسندیدہ شخص کے ٹکڑے کرا دیتے۔ اسے زندہ جلا دینے کا حکم دیتے۔ اس کی آنکھوں میں گرم سلائیاں پھروا دیتے۔ حلق سے اس کی زبان کھنچوا دیتے۔ اسے زندہ دیوار میں چنوا دیتے۔ اقتدار کی خاطر اپنے ہی بھائی کا سر کٹوا دیتے اور اس پر کامیابی کا جشن مناتے۔ امام احمد کے زمانے میں المتوکل علی اللہ بھی مسند اقتدار پر بیٹھا۔ اس کی شقاوت قلبی کا ایک واقعہ سنیے۔ اس نے اپنے بیٹوں، معتز اور موید کے استاد یعقوب بن سکیت کو چت لٹا کر چند لڑکوں کو حکم دیا کہ اس کے پیٹ پر اس وقت تک کودتے رہیں جب تک یہ مر نہیں جاتا۔ یہ سزا اس لیے دی گئی تھی کہ متوکل نے ان سے یہ پوچھا تھا کہ تمھارے نزدیک میرے دونوں بیٹے افضل ہیں یا حضرت حسن و حسین؟ اس کے جواب میں استاد یعقوب نے یہ کہہ دیا تھا کہ ان سے تو حضرت علی کا غلام بھی افضل ہے۔

تفصیلی تحریر میں ایک مقام پر یہ بتایا گیا ہے کہ امام احمد نے اپنے مجموعۂ احادیث ''المسند'' کے لیے ساتھ لاکھ پچاس ہزار میں سے تیس ہزار کے قریب احادیث کا انتخاب کیا، لیکن اس کے باوجود یہ بات کہیں پڑھنے کو نہیں ملتی کہ کسی شخص نے امام احمد کو منکر حدیث قرار دے دیا ہو، بلکہ علم حدیث کے معاملے میں ان کے لیے تعریفی کلمات ہی ادا کیے جاتے ہیں۔ جبکہ آج کوئی شخص جب کسی حدیث پر محدثین ہی کے اصولوں کی بنیاد پر کوئی تنقید کر دے تو اسے منکر حدیث قرار دے دیا جاتا ہے۔ اس جہت سے غور کریں تو محسوس ہوتا ہے کہ صحیح علمی رویہ اختیار کرنے کے معاملے میں ہمارا دور قدیم، ہمارے دور جدید سے کس قدر بہتر تھا۔

''رفتہ و حاضر'' ہمارا ایک نیا سلسلہ ہے۔ اس سلسلے کے تحت ہم ماضی اور حال کی بڑی شخصیات یا اہم واقعات سے متعلق ان شاء اللہ وقتاً فوقتاً اہل علم کی تحریریں شائع کرتے رہیں گے۔ ''وفیات'' کے ضمن میں ابوالحسن علی ندوی پر تحریر لکھی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ''شذرات''، ''قرآنیات''، ''معارف نبوی''، ''مناجات''، ''دین و دانش''، ''دیسئلون'' اور ''خیال و خامہ'' کے سلسلے حسب سابق موجود ہیں۔

—— محمد بلال



www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

# مسلمان دین مساوات کو ماننے کے باوجود.....

کالم نویس جناب منو بھائی ایک دفعہ دو دوستوں کے ہمراہ ڈرامہ نگار خواجہ معین الدین صاحب کو ملنے ان کے گھر گئے۔ وہ کہتے ہیں کہ خواجہ صاحب نے جس انداز سے ہمارا استقبال کیا اور جس قدر تواضع کی، اس نے ہمیں اس غلط فہمی میں مبتلا کر دیا کہ ہم کوئی بہت اہم اور بڑے آدمی ہیں اور خواجہ صاحب کو ہم سے کچھ زیادہ ہی محبت ہے، مگر وہاں بیٹھے بیٹھے کورنگی سے ایک رکشا والا خواجہ صاحب سے ملنے آگیا۔ خواجہ صاحب نے اس کی بھی ویسی ہی خاطر تواضع کی اور اسی توجہ سے باتیں سنیں، جس توجہ سے ہماری باتیں سن رہے تھے۔ تب معلوم ہوا کہ بڑے آدمی ہم نہیں، خواجہ صاحب ہیں[1]۔

یہ ایک دردناک حقیقت ہے کہ ہم مسلمان دین مساوات کو ماننے کے باوجود مساوات کے عملاً قائل نہیں ہیں۔ ایک خاص قسم کی ''برہمنیت'' ہمارے رویے سے کسی نہ کسی شکل میں ظاہر ہوتی رہتی ہے۔ ہم محض تقویٰ کی بنیاد پر کسی شخص کے بڑے یا چھوٹے ہونے کا فیصلہ نہیں کرتے۔ ذات پات کے حوالے سے سوچیں تو موچی، نائی، لوہار، کمہار، تیلی، ترکھان، جولاہے جو دینیوی نظام چلانے میں بہت اہم کردار ادا کر رہے ہیں، ہمارے ہاں حقیر لوگ سمجھے جاتے ہیں۔ دور حاضر میں نئے پیشے وجود میں آئے ہیں، ان میں ویلڈر، پلمبر، ڈرائیور بھی، جن کے بغیر زندگی کی گاڑی نہیں چل سکتی، ہمارے معاشرے میں کمتر انسان خیال کیے جاتے ہیں۔ دفتروں میں کلرک، چپڑاسی اور خانساماں کو دوسرے درجے کی مخلوق سمجھا جاتا ہے۔ گھروں میں صورت حال یہ ہے کہ بچے بھی اپنی عمر سے بڑے ملازمین کو واحد کے صیغے میں مخاطب کرتے ہیں۔

---

۱۔ جنگ سنڈے میگزین، ۲۷ دسمبر ۱۹۹۸ء۔ شخصیت، کچھ یادیں، کچھ باتیں۔

اسی طرح وہ لوگ جنھیں عزت، شہرت، دولت یا کوئی نعمت حاصل ہوتی ہے تو وہ اس پر خدا کے شکر گزار عاجز بندے بننے کے بجاے اسے اپنی قابلیت اور کوشش کا نتیجہ خیال کرنے لگتے ہیں اور یوں اترانے اور تکبر کرنے لگتے ہیں۔ اور وہ لوگ جو اس عزت، شہرت، دولت یا نعمت سے محروم ہوتے ہیں انھیں حقارت کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں۔

یہ رویہ محض ایک معاشرتی مسئلہ نہیں ہے، بلکہ دین و شریعت کے اعتبار سے بھی ایک انتہائی اہم معاملہ ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسروں کو اپنے سے حقیر سمجھنے کو تکبر قرار دیا[۲] اور قرآن مجید میں ہے کہ جس طرح سوئی کے ناکے سے اونٹ کا گزرنا محال ہے اسی طرح جنت کے دروازے سے متکبر کا گزرنا ناممکن ہے[۳]۔ اس آیت کی تفسیر میں مولانا امین احسن صاحب اصلاحی تکبر کا دولت کے ساتھ تعلق واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''انجیل میں ہے ''اور یسوع نے اپنے شاگردوں سے کہا: میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ دولت مند کا آسمان کی بادشاہت میں داخل ہونا مشکل ہے۔ اور پھر تم سے کہتا ہوں کہ اونٹ کا سوئی کے ناکے سے نکل جانا اس سے آسان ہے کہ دولت مند خدا کی بادشاہت میں داخل ہو۔'' (متی ۱۹: ۲۳۔۲۴) قرآن اور انجیل کی تعبیر میں بس یہ فرق ہے کہ سیدنا مسیح علیہ السلام نے سبب استکبار یعنی دولت کا حوالہ دیا ہے اور قرآن نے اصل جرم یعنی استکبار کا...... سیدنا مسیح علیہ السلام کا ارشاد ہے مبارک ہیں وہ جو دل کے غریب ہیں، آسمان کی بادشاہی میں وہی داخل ہوں گے۔'' (تدبر قرآن، ج۳، ص ۲۵۸)

تکبر کی اسی سنگینی کی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہے کہ جس شخص کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی تکبر ہو گا، وہ جنت میں داخل نہ ہو گا[۴]۔

یہ تکبر عام لوگوں کے ہاں تو پایا ہی جاتا ہے جیسے کہ اوپر مذکور واقعہ میں جناب منو بھائی نے ایک ڈرامہ نگار کو تو ''خواجہ معین الدین صاحب'' لکھا جبکہ رکشا والے صاحب کو ''رکشا والا'' ہی کہا۔ مگر افسوس ہے کہ دین دار اور بعض دین کا علم رکھنے والے بھی اس ''برہمنیت'' میں پوری طرح مبتلا نظر آتے ہیں۔ یہ بات عام مشاہدے

---

۲۔ ابوداؤد، کتاب اللباس، باب ماجاء فی الکبر۔

۳۔ الاعراف ۷: ۴۰۔

۴۔ ابوداؤد، کتاب اللباس، باب ماجاء فی الکبر۔

میں آتی ہے کہ دین کا علم رکھنے والے بعض افسر یا مالک اپنے دفتر کے ڈرائیور یا چپڑاسی یا گھر کے ملازم کو ''آپ'' کہہ کر نہیں پکارتے۔ خواہ وہ ڈرائیور، چپڑاسی یا ملازم عمر میں ان سے بڑا ہی کیوں نہ ہو۔ اس معاملے میں شاید وہ یہ قطعی راے قائم کر چکے ہیں کہ یہ لوگ ان سے حقیر ہیں۔ حالانکہ اہل علم وہ لوگ ہیں جنھیں دین مساوات پر دوسروں سے بڑھ کر عمل کرنا چاہیے۔

—— محمد بلال

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

## البیان

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

### سورۃ البقرۃ

(۱۳)

(گذشتہ سے پیوستہ)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ؕ وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ

(تم یہی کرتے رہے[۱۸۸] یہاں تک کہ) اِس کے بعد پھر تمھارے دل سخت ہو گئے، اِس طرح کہ گویا وہ پتھر ہیں یا اُن سے بھی زیادہ سخت۔ اور پتھروں میں تو ایسے بھی ہیں جن سے نہریں پھوٹتی ہیں اور ایسے بھی ہیں جو پھٹ جاتے ہیں اور اُن سے پانی بہ نکلتا ہے اور ایسے بھی ہیں کہ اللہ کے خوف سے گر پڑتے ہیں[۱۸۹]۔ (یہ حقیقت ہے کہ تم یہی کرتے رہے ہو)، اور جو

۱۸۸۔ یعنی دین و شریعت کے ساتھ اسی طرح حیلہ بازی، کٹ حجتی اور ڈھٹائی کا معاملہ کرتے رہے۔

۱۸۹۔ مطلب یہ ہے کہ پتھر تو پتھر ہو کر بھی اُن صلاحیتوں سے محروم نہیں ہوتے جو قدرت کی طرف سے

بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ﴿۷۴﴾
اَفَتَطۡمَعُوۡنَ اَنۡ یُّؤۡمِنُوۡا لَکُمۡ وَقَدۡ کَانَ فَرِیۡقٌ مِّنۡہُمۡ یَسۡمَعُوۡنَ کَلٰمَ اللّٰہِ
ثُمَّ یُحَرِّفُوۡنَہٗ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا عَقَلُوۡہُ وَہُمۡ یَعۡلَمُوۡنَ﴿۷۵﴾ وَاِذَا لَقُوا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا

---

کچھ تم کرتے رہے ہو، اللہ اُس سے بے خبر نہیں ہے[190]۔ ۷۴

اِس[191] کے باوجود، مسلمانو) کیا تم اِن سے یہ توقع رکھتے ہو کہ یہ تمھاری بات مان لیں گے، اور (یہ وہ لوگ ہیں کہ) اِن میں سے ایک گروہ اللہ کا کلام سنتا رہا ہے اور اِسے اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد جانتے بوجھتے[192]، اِس میں تحریف[193] کرتا رہا ہے۔ اور (یہ وہ لوگ ہیں کہ) جب مسلمانوں سے

---

اُن کے اندر ودیعت ہوتی ہیں۔ تم اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہو کہ طور کس طرح لرزہ براندام ہوا اور تمھارے لیے کس طرح ایک چٹان سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے، لیکن یہ تم ہو کہ اخلاقی بگاڑ نے تمھارے دل کی تمام سوتیں اس طرح خشک کر دی ہیں کہ تمھارے سینے میں دھڑکتا ہوا گوشت کا یہ لوتھڑا پتھر بن گیا ہے، بلکہ اس کی سختی پتھروں اور چٹانوں کی سختی سے بھی بڑھ گئی ہے۔

۱۹۰۔ یعنی وہ تمھارے کرتوتوں سے خوب واقف ہے، اُس کے سامنے اپنے تقدس اور بزرگی کی حکایت نہ بڑھاؤ۔

۱۹۱۔ یہود سے خطاب کے بیچ میں یہ مسلمانوں کی طرف التفات ہے۔ اِسی طرح کا ایک التفات اِس سے پہلے آیات ۲۱-۲۹ میں یثرب کے مشرکین کی طرف گزر چکا ہے۔ اس سے مقصود مسلمانوں کو یہ اطمینان دلانا بھی ہے کہ وہ یہود کی مخالفت سے بددل نہ ہوں اور یہود کی بعض پسِ پردہ حرکتوں سے انھیں آگاہ کرنا بھی ہے تاکہ سادہ لوح مسلمان اُن کے ایمان کے دعووں سے متاثر ہو کر اُن کے فریب میں نہ آجائیں۔

۱۹۲۔ تحریف کے ساتھ یہ قید اس بات کو واضح کرتی ہے کہ تحریف پر تحریف کا اطلاق اُسی وقت ہوتا ہے جب وہ جانتے بوجھتے ہوئے کی جائے۔ یہی چیز تحریف کو ایک سنگین جرم بناتی ہے اور اس کے مرتکبین کو اُس روشنی سے یک قلم محروم کر دیتی ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے نبیوں کے ذریعے سے انسانوں کو بخشتا ہے۔

۱۹۳۔ تحریف کے معنی کسی بات یا کلام کو بدل دینے کے ہیں۔ اہلِ کتاب اس کی جن صورتوں کے مرتکب

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚۖ وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ
عَلَيْكُمْ لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۶﴾ اَوَلَا يَعْلَمُوْنَ
اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴿۷۷﴾ وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ

ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے مان لیا ہے[۱۹۴] اور جب آپس میں اکیلے ہوتے ہیں تو کہتے ہیں: کیا تم اِن کو وہ بتاتے ہو جو اللہ نے تم پر کھولا ہے کہ وہ اِس کی بنیاد پر تمھارے پروردگار کے پاس تم سے حجت کریں۔ کیا تم سمجھتے نہیں ہو؟ کیا یہ نہیں جانتے کہ جو کچھ یہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں،

---

ہوئے، وہ استاذ امام امین احسن اصلاحی کے الفاظ میں یہ ہیں:

''ایک بات کی دیدہ ودانستہ ایسی تاویل کر دی جائے جو قائل کے منشا کے بالکل خلاف ہو۔

کسی لفظ کے طرزِ ادا اور قراءت میں ایسی تبدیلی کر دی جائے جو لفظ کو کچھ سے کچھ بنا دے۔ مثلاً مروہ کو بگاڑ کر مورہ یا مریا وغیرہ کر دیا گیا۔

کسی عبارت میں یا کلام میں ایسی کمی بیشی کر دی جائے جس سے اس کا اصل مدعا بالکل خبط ہو کر رہ جائے مثلاً، حضرتِ ابراہیم کے ہجرت کے واقعے میں یہود نے اِس طرح ردوبدل کر دیا کہ خانہ کعبہ سے ان کا کوئی تعلق ثابت نہ ہو سکے۔

کسی ذو معانی لفظ کا وہ ترجمہ کر دیا جائے جو سیاق وسباق کے بالکل خلاف ہو۔ مثلاً عبرانی کے ابن کا ترجمہ بیٹا کر دیا گیا، دراں حالیکہ اس کے معنی بندہ اور غم کے بھی آتے ہیں۔

ایک بات کا مفہوم بالکل واضح ہو، لیکن اس کے متعلق ایسے سوالات اٹھا دیے جائیں جو اس واضح بات کو مبہم بنا دینے والے یا اس کو بالکل مختلف سمت میں ڈال دینے والے ہوں۔'' (تدبر قرآن ج ۱ ص ۲۵۲)

۱۹۴۔ یہود یہ اقرار جس مفہوم میں کرتے تھے، اس کی وضاحت ہم اس سے پہلے حاشیہ ۲۶ کے تحت کر چکے ہیں۔ یہاں اتنی بات مزید واضح ہوتی ہے کہ اپنے اس خاص مفہوم میں وہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا اقرار کرتے تو اس موقع پر بعض اوقات وہ پیشین گوئیاں بھی بیان کر دیتے تھے جو آپ کے متعلق ان کے صحیفوں میں بیان ہوئی ہیں۔



www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ﴿٧٨﴾ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ
الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ق ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا
قَلِيْلًا ط فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ﴿٧٩﴾
وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ط قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا

---

اللہ اُن سب باتوں سے باخبر ہے۔ اور (یہ وہ لوگ ہیں کہ) اِن میں بن پڑھے عامی[۱۹۵] بھی ہیں جو کتابِ الٰہی کو صرف اپنی آرزوؤں[۱۹۶] کا ایک مجموعہ سمجھتے ہیں اور اپنے گمانوں ہی پر چلتے ہیں ـــــ سو تباہی ہے اُن کے لیے جو اپنے ہاتھوں سے شریعت تصنیف کرتے ہیں[۱۹۷]، پھر کہتے ہیں: یہ اللہ کی طرف سے ہے، تاکہ اِس کے ذریعے سے تھوڑی سی قیمت حاصل کر لیں۔ سو تباہی ہے اُن کے لیے اُس چیز کے باعث جو اُن کے ہاتھوں نے لکھی اور تباہی ہے اُن کے لیے اُس چیز کے باعث جو (اِس کے ذریعے سے) وہ کماتے ہیں ـــــ اور (یہ وہ لوگ ہیں کہ) اِنھوں نے دعویٰ کیا ہے کہ دوزخ کی آگ اِنھیں صرف گنتی کے چند دنوں ہی کے لیے چھوئے گی[۱۹۸]۔ ان سے پوچھو، کیا اللہ

---

۱۹۵۔ اصل میں لفظ 'امیون' استعمال ہوا ہے۔ یہ 'امی' کی جمع ہے جس کے معنی ان پڑھ کے ہیں۔ اس آیت میں جس طرح ان کا ذکر ہوا ہے، اس سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ اوپر کلامِ الٰہی میں تحریف کرنے والے جس گروہ کا بیان ہے اس سے یہود کے علما اور پڑھے لکھے لوگ مراد ہیں۔

۱۹۶۔ یعنی مثال کے طور پر یہ آرزوئیں کہ دوزخ کی آگ ہمیں گنتی کے چند روز ہی کے لیے چھوئے گی اور جنت میں صرف یہودی اور نصرانی ہی جائیں گے اور آخرت کی فوز و فلاح صرف ہمارے لیے ہی خاص ہے اور ہم اللہ کے بیٹے اور محبوب ہیں۔

۱۹۷۔ اس سے مراد وہ طبع زاد اور من گھڑت فتوے ہیں جو یہود کے علما محض اپنی دنیوی اغراض کو پورا کرنے اور اپنے پیرووں کو خوش کرنے کے لیے جاری کرتے تھے۔

۱۹۸۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نجات کے معاملے میں ان کا سارا اعتماد عقیدہ و عمل کے بجائے صرف اپنی گروہی نسبت ہی پر رہ گیا تھا۔

فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗۤ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۰﴾ بَلٰى مَنْ
كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا
خٰلِدُوْنَ ﴿۸۱﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ
فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۲﴾ ع

سے تم نے کوئی عہد لیا ہے کہ اللہ کسی حال میں اپنے اُس عہد کی خلاف ورزی نہ کرے گا یا تم اللہ پر ایسی تہمت باندھ رہے ہو جس کے بارے میں تم کچھ نہیں جانتے[۱۹۹]۔ ہاں[۲۰۰]، کیوں نہیں، جن لوگوں نے کوئی بدی کمائی ہے اور اُن کے گناہ نے اُنھیں پوری طرح گھیر لیا ہے، وہی دوزخ والے ہیں[۲۰۱]۔ وہ اُس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور جو ایمان لائے اور اُنھوں نے نیک عمل کیے، وہی جنت والے ہیں[۲۰۲]۔ وہ اُس میں ہمیشہ رہیں گے۔ ۷۵-۸۲

۱۹۹۔ یعنی جس کی کوئی سند تمھاری کتاب میں موجود نہیں ہے۔ تم نے یہ بات محض اپنے جی سے گھڑ کر اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر دی ہے۔

۲۰۰۔ پچھلی فصل کے آخر میں جس طرح 'ان الذین آمنوا والذین ھادوا' والی آیت آئی تھی، اسی طرح دوسری فصل کے آخر میں یہ آیت وارد ہوئی ہے۔ دونوں کا موقع و محل اور مقصد ایک ہی ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ قرآن کے مضامین کس خوب صورتی کے ساتھ اس کے نظم میں پروئے ہوئے ہیں۔

۲۰۱۔ مطلب یہ ہے کہ جو شخص کسی برائی کا ارتکاب کرے اور وہ برائی اس کی زندگی کا اس طرح احاطہ کر لے کہ وہ خدا کے حضور میں پیشی کے شعور اور توبہ و ندامت کی توفیق ہی سے محروم ہو جائے تو اس کے لیے ہمیشہ کی جہنم ہے خواہ اس کا تعلق کسی گروہ سے ہو۔

۲۰۲۔ یعنی خواہ ان کا تعلق کسی گروہ سے ہو، وہ بہر حال جنت میں جائیں گے۔

[باقی]

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

طالب محسن

# غلبۂ اسلام

(مشکوٰۃ، کتاب الایمان: حدیث ۴۲:۴۳)

وعن المقداد رضى الله عنه انه سمع رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول : لا يبقى على ظهر الأرض بيت مدر و لا وبر الا أدخله الله كلمة الاسلام ، بعز عزيز و ذل ذليل - إما يعزهم الله فيجعلهم من اهلها أو يذلهم فيدينون لها - قلت : فيكون الدين كله لله۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

''حضرت مقداد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا: اس سرزمین کی پشت پر کوئی جھونپڑا اور کوئی مکان نہیں بچے گا مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اس میں اسلام کا کلمہ داخل کر دے گا، کسی کو عزت دے کر اور کسی کو ذلیل کر کے۔ وہ جنھیں اللہ معزز کرے گا انھیں اس کلمے کا اہل ٹھیرائے گا اور جنھیں ذلیل کرے گا وہ اسے (مجبوراً) مان لیں گے۔ (اس پر) میں نے کہا: پھر تو سارے کا سارا دین اللہ تعالیٰ کے لیے ہو جائے گا۔''

## لغوی بحث

الارض: سرزمینِ عرب۔ 'ارض' یعنی زمین اگرچہ عام لفظ ہے، لیکن اس پر الف لام عہد کا ہے۔ چنانچہ اس روایت میں اس سے اہلِ عرب کی سرزمین ہی مراد ہے۔

مدر: یہ 'مدرة' کی جمع ہے۔ اس کے معنی اینٹ کے ہیں۔ 'بیت مدر' سے مراد اینٹ گارے سے بنے ہوئے مکان ہیں۔ اس سے شہری اور دیہاتی آبادیاں مراد ہیں۔

وبر: اون، 'بیت وبر' سے مراد خیمہ ہے۔ اس سے عرب کے بدو مراد ہیں۔ 'بیت مدر و وبر' سے اہلِ عرب کے شہری، دیہاتی اور خانہ بدوش تمام قبائل کا احاطہ ہو جاتا ہے۔

فیدینون: ماننا، تسلیم کر لینا۔

## متون

یہ روایت صاحبِ مشکٰوۃ نے مسندِ احمد سے لی ہے۔ بعض سابقہ روایات کی طرح اس میں بھی ہمارے ہاں متداول نسخے سے فرق ہے۔ صاحبِ مشکٰوۃ نے روایت کے آخر میں 'قلت: فیکون الدین کله لله'[1] کا جملہ درج کیا ہے۔ لیکن متداول نسخے میں یہ جملہ نہیں ہے۔ مسندِ احمد میں یہ روایت ایک اور صحابی تمیم داری رضی اللہ عنہ سے بھی درج کی گئی ہے۔ اس روایت کے الفاظ سے زیرِ بحث روایت کے بعض پہلوؤں کی وضاحت ہوتی ہے:

عن تمیم الداری رضی الله عنه قال : سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول: لیبلغن هذا الأمر مابلغ اللیل و النهار - و لا یترک الله بیت مدر و لا وبر الا أدخله هذا الدین بعز عزیز و بذل ذلیل- عزا یعز الله به الإسلام و ذلا یذل الله به الکفر - و کان تمیم الداری یقول قد عرفت ذلک فی أهل بیتی - لقد أصاب من أسلم منهم الخیر و الشرف و العز و لقد أصاب من کان منهم کافرا الذل و

”حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ یہ معاملہ گردشِ لیل و نہار کے ساتھ (اپنے انجام کو) پہنچے گا۔ اللہ تعالیٰ کسی مکان اور کسی خیمے کو اس میں اسلام داخل کیے بغیر نہیں چھوڑیں گے۔ معزز کے لیے عزت کا ذریعہ اور رسوا کے لیے رسوائی کا باعث۔ عزت جو اللہ نے اسلام کو دی ہے۔ رسوائی جو اللہ نے کفر پر مسلط کی ہے۔ حضرت تمیم داری کہا کرتے تھے کہ میں نے یہ بات اپنے گھر میں (پوری ہوتی دیکھ کر) پہچان لی تھی۔ وہ شخص جس نے اسلام کو اختیار کر لیا اسے بھلائی، شرف اور مرتبہ حاصل ہے۔ جو کفر کی راہ

---

۱۔ یہ سورۂ انفال کی آیت ۳۹ کا حوالہ ہے جس میں کفارِ مکہ کے خلاف کارروائی کی غایت بتائی گئی ہے۔

الصغار و الجزية۔ | پر قائم رہا ذلت، کمتری اور جزیہ کا قانون اس کا مقدر ہے۔‘‘

ان روایتوں میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ حضرت مقداد کی روایت میں ذلت کا شکار ان لوگوں کو قرار دیا گیا ہے جو مجبوراً ایمان لائے ہوئے ہیں۔ جبکہ حضرت تمیم داری کی روایت میں ذلت کا اطلاق اس گروہ پر کیا گیا ہے جو ایمان نہیں لایا اور اور اس نے جزیہ ادا کر کے کم تر حالت کو قبول کیا ہے۔

## معنی

یہ روایت بنیادی طور پر ایک پیشین گوئی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ ایک زمانہ آئے گا جب سرزمینِ عرب میں کوئی غیر مسلم باقی نہیں بچے گا۔ ہر گھر اسلام کی تعلیمات سے بہرہ مند ہو جائے گا۔ کسی کے لیے اس کا امکان باقی نہیں رہے گا کہ وہ حالتِ کفر میں زندہ رہے۔ وہ ہر حال میں اسلام قبول کرے گا۔ خواہ یہ بہ رضا و خوشی ہو اور خواہ بے دلی اور مجبوری کے ساتھ۔ پہلی صورت میں یہ صاحبِ ایمان کے لیے باعثِ شرف و مرتبہ ہو گا اور دوسری صورت میں وہ اپنے ضمیر کے آگے بھی اور معاشرے میں بھی رسوا ہو گا۔

عام طور پر اس پیشین گوئی کو تمام دنیا سے متعلق مانا گیا ہے۔ چنانچہ یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ یہ قیامت کے قریب پوری ہو گی۔ ہمارے نزدیک اس پیشین گوئی کا تعلق صرف تمام اہلِ عرب سے ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ سورۂ توبہ میں جہاں اہلِ عرب کے کفار کو مار دینے کا حکم دیا گیا ہے وہیں یہود و نصاریٰ کے لیے جزیہ دے کر رہنے کی صورت بیان ہوئی ہے۔

حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ کی روایت نے البتہ ایک مسئلہ پیدا کیا ہے۔ انھوں نے اس پیشین گوئی کا اطلاق تمام غیر مسلموں پر کیا ہے۔ یہ بات درست نہیں ہے۔ جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے: قرآنِ مجید میں واضح ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بحیثیتِ پیغمبر اتمامِ حجت کے بعد آپ کے مخاطبین کے لیے دو ہی صورتیں تھیں۔ ایک یہ کہ وہ ایمان لائیں ورنہ انھیں زندگی سے محروم ہونا پڑے گا۔ یہ صورت یہود و نصاریٰ کے سوا تمام اہلِ عرب کے لیے تھی۔ دوسری صورت یہ کہ وہ جزیہ ادا کر کے ماتحت ہو کر رہیں۔ یہ صورت صرف اہلِ کتاب کے لیے تھی۔

اوپر روایت میں جس آیت کا حوالہ دیا گیا ہے، وہ بھی اسی قانون سے متعلق ہے، جس کا نفاذ حجۃ الوداع کے موقع پر کیا گیا تھا۔ حضرت مقداد کا ذہن بجا طور پر اس آیت کی طرف گیا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت تمیم داری کے سامنے پیشین گوئی کا یہ پہلو نہیں تھا۔ لہٰذا انھوں نے جس پہلو کو نمایاں کیا ہے اسے درست قرار دینا ممکن نہیں۔

صاحبِ مشکوٰۃ نے اسے اس فصل میں ایمان کی اس برکت کے پہلو سے لیا ہے کہ یہ باعثِ عزت و شرف ہے۔ بے شک اس روایت سے یہ پہلو بھی نکلتا ہے لیکن یہ ایک ضمنی پہلو ہے اور اس کا تعلق بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے براہِ راست مخاطبین سے ہے۔ روایت کا اصل موضوع پیشین گوئی ہے، جسے ہم نے واضح کر دیا ہے۔

## کتابیات

مسندِ احمد عن المقداد و عن تمیم داری۔

---

# جنت کی چابی

عن وهب بن منبه، قيل له : أليس لا إلٰه إلا الله مفتاح الجنة ؟ قال : بلى - و لكن ليس مفتاح إلا وله أسنان - فان جئت بمفتاح له أسنان فتح لك - و إلا لم يفتح لك۔

---

”حضرت وہب بن منبہ سے روایت ہے کہ ان سے پوچھا گیا: کیا 'لا إلٰه إلا الله' جنت کی چابی نہیں ہے۔ انھوں نے جواب دیا: کیوں نہیں۔ لیکن کوئی چابی ایسی نہیں ہوتی جس کے دندانے نہ ہوں۔ چنانچہ اگر تم ایسی چابی لائے جس کے دندانے ہوئے تو وہ تمھارے لیے کھول دے گی اور اگر ایسا نہ ہوا تو نہیں کھولے گی۔“

## لغوی بحث

مفتاح الجنة: جنت کی چابی، یہ جنت کو پانے کا سبب بننے والی شے کے لیے ایک بلیغ تعبیر ہے۔

أسنان: 'سن' کی جمع ہے، جس کے معنی دانت کے ہیں، عربی میں چابی کے دندانوں کے لیے بھی یہی لفظ آتا ہے۔ حضرت وہب بن منبہ نے چابی کے استعارے کو آگے بڑھاتے ہوئے اعمالِ صالحہ کے لیے چابی کے دندانوں کو علامت بنالیا ہے۔

## متون

یہ روایت حضرت وہب بن منبہ رحمہ اللہ مشہور تابعی کا قول ہے۔ جسے بخاری نے کتاب الجنائز میں پہلے باب



www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

کے عنوان کے ساتھ بطور تعلیق درج کیا ہے۔ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی حیثیت نہیں رکھتا اور نہ صحاح، مؤطا، دارمی یا مسند احمد میں سے کسی کتاب میں اسے اس حیثیت سے روایت کیا گیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی اقوال میں یہ تعبیر نماز کے لیے اختیار کی گئی ہے۔

وہب بن منبہ کے قول کی حیثیت سے بھی اسے حدیث کی متداول کتب میں صرف بخاری نے نقل کیا ہے۔ چنانچہ اس کے دوسرے کسی متن کا کوئی وجود نہیں ہے۔

## معنی

حضرت وہب نے دین کی اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھا ہے کہ محض ایمان یقینی نجات کا باعث نہیں ہو گا۔ سچے ایمان کے ساتھ صالح اعمال کا ہونا بھی ضروری ہے۔ ایمان کے شعبوں والی روایت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حقیقت کو بڑی اچھی طرح واضح کیا ہے کہ جس دل میں ایمان کی حقیقت اترتی ہے اس کا اثر کردار پر بھی پڑتا ہے۔ اگر ایمان کے ساتھ کردار تبدیل نہیں ہوا تو یہ ایمان کے رسوخ میں کمی کا نتیجہ ہے۔ بلکہ کردار کی بعض خرابیاں ایسی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے نفاق کی علامت قرار دیا ہے۔ ہمارا اشارہ 'آیات منافق ثلاث' والی روایت کی طرف ہے۔ حضرت وہب نے بھی چابی کے دندانوں کی تعبیر سے اسی حقیقت کو واضح کیا ہے۔ جس طرح کوئی چابی دندانوں کے بغیر نہیں ہوتی اسی طرح اعمال کے بغیر ایمان کا بھی کوئی تصور نہیں۔ جس طرح تالا کھولنے میں وہی چابی مؤثر ہے جس کے دندانے ہوں اسی طرح جنت میں داخل ہونے کے لیے وہی ایمان مفید ہو گا جس کے ساتھ نیکیاں ہوں گی۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

## کتابیات

بخاری، کتاب الجنائز، باب ۱۔

مناجات

ساجد حمید

# آغازِ سفر پر اذکار

(۱)

اللَّهُمَّ إِنَّا نَسْأَلُكَ فِي سَفَرِنَا هَذَا الْبِرَّ وَالتَّقْوَى وَمِنَ الْعَمَلِ مَا تَرْضَى. اللَّهُمَّ هَوِّنْ عَلَيْنَا سَفَرَنَا هَذَا وَاطْوِ عَنَّا بُعْدَهُ اللَّهُمَّ أَنْتَ الصَّاحِبُ فِي السَّفَرِ وَالْخَلِيفَةُ فِي الْأَهْلِ. اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنْ وَعْثَاءِ السَّفَرِ وَكَآبَةِ الْمَنْظَرِ وَسُوءِ الْمُنْقَلَبِ فِي الْمَالِ وَالْأَهْلِ۔

اے اللہ، ہم اس سفر کے لیے برو تقویٰ کا زادِ سفر طلب کرتے ہیں اور تیرے پسندیدہ عمل کی توفیق چاہتے ہیں۔

اے اللہ، ہمارے لیے یہ سفر آسان کر دے، اس کی طوالت کو کم کر دے۔

اے اللہ، تو سفر میں ہم مسافروں کا رفیق اور ہمارے پیچھے ہمارے گھر والوں کا محافظ و نگران ہے۔

اے اللہ، ہم سفر کی مشقت سے، غم ناک مناظر سے اور ایسی واپسی جس سے گھر میں اہل و عیال اور مال و دولت میں کوئی بھی خرابی اور کمی ہو، تیری پناہ چاہتے ہیں۔

---

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دعا کا آغاز اس بات سے کیا ہے کہ اے اللہ ہمیں زادِ راہ کے طور پر برو تقویٰ کی نعمت سے بہرہ مند فرما۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا قرآنِ مجید کی ہدایت کے مطابق کی ہے۔ قرآنِ مجید نے حج کے سفر کے لیے حج میں رفث وفسوق سے روکتے ہوئے یہ فرمایا کہ حج پر جاتے ہوئے فسق و فجور اور رفث و فساد کا عزم و ارادہ نہ کرو۔ بلکہ تقویٰ و نیکی کا زادِ راہ اختیار کرو۔ تزودا فإن خير الزاد التقوى۔ (البقرہ ۲: ۱۹۷)۔ تقویٰ کو زادِ راہ بناؤ، اس لیے کہ یہ سب سے بہتر زادِ راہ ہے۔

افسوس ہے کہ اس وقت اکثر حاجی اللہ تعالیٰ کی اس ہدایت کا خیال نہیں کرتے اور حج کرتے وقت بھی صحیح معنی میں تقویٰ اختیار نہیں کرتے۔ اس زادِ راہ کی کمی کا منظر دیکھنا ہو تو حجرِ اسود کے پاس استلام کے موقع پر دیکھا جا سکتا ہے کہ ایسے لوگ کس طرح کمزور اور بوڑھے حاجیوں کے لیے نہایت تکلیف کا باعث بنتے اور نہایت مصروفیت کے وقت حجرِ اسود پر قبضہ کیے کھڑے رہتے ہیں۔ یہ سب تقویٰ کے خلاف ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی ہدایت کے مطابق حج کے سفر کے علاوہ اسی زادِ سفر کی دعا ہے۔

اس دعا کا مزاج بھی تعلیمی ہے۔ اس میں تقویٰ کا زادِ راہ اپنانے کی تعلیم دی گئی ہے۔ جب آدمی گھر سے لمبے سفر کے لیے نکلتا ہے تو اس کے عزائم کئی طرح کے ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح سفر اچھے امکانات کے ساتھ برے امکانات کے پیدا کرنے کا وسیع ذریعہ بھی بنتا ہے۔ گھر سے نکلتے وقت آدمی کے عزائم جیسے بھی ہوں سفر کے پیدا کردہ یہ امکانات ان عزائم میں تبدیلی کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔

دوسرے شہروں یا ملکوں میں ایک خاص طرح کی آزادی بھی آدمی کو حاصل ہو جاتی ہے۔ نہ اس کے عزیزوں میں سے اسے کوئی دیکھنے والا ہوتا ہے اور نہ گھر والوں میں سے۔ ان وجوہ سے لوگ برائی کو اختیار کرنے میں آسانی محسوس کرتے ہیں۔ اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تقویٰ کو زادِ راہ بنانے کی اس دعا کے ذریعے سے ہمیں تلقین کی ہے۔ اللہ کی پسند کے عمل اختیار کرنے کی دعا مانگی ہے۔

اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا کی ہے کہ اے اللہ، ہمارے لیے یہ سفر آسان کر دے، اس کی طوالت کو کم کر دے۔ دینی پہلو سے دعا کرنے کے بعد، یہ دعا سفر کے دنیوی پہلو کے متعلق سکھائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے اس سفر کو آسان کر دے۔ ایسی دعاؤں میں اگر ترتیبِ زمانی ہو تو ''دین'' اور ''آخرت'' بعد میں آئیں گے اور اگر ان کی اہمیت کے لحاظ سے ترتیب ہو تو دین و آخرت پہلے آئیں گے۔ اسی لحاظ سے اس دعا میں دنیوی پہلو کے بجائے پہلے دینی پہلو سے دعا کی گئی ہے۔ یعنی اپنی اہمیت کے اعتبار سے نیکی کا زادِ سفر، سفر کی آسانی کے مقابلے میں زیادہ اہم ہے۔ یعنی اگر نیکی چلی گئی تو اس سے دونوں جہانوں کا نقصان ہے اور اگر سفر مشکل ہوا تو یہ صرف سفر کی ناکامی ہو گی۔

اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا کی ہے کہ۔اے اللہ تو سفر میں ہم مسافروں کا رفیق اور ہمارے پیچھے ہمارے گھر والوں کا مالک و آقا ہے۔ یہ الفاظ اس احساس کی وجہ سے زبان سے نکلے ہیں، جو آدمی لمبے سفر پر نکلتے ہوئے اپنے اور اپنے اہلِ خانہ کے بارے میں محسوس کرتا ہے۔ سفر میں مسافر تنہا جا رہا ہوتا ہے یا کم سے کم اپنے اہل خانہ سے جدا ہونے کا احساس اسے کمزور کر دیتا ہے۔ اور اپنی عدم موجودگی میں اسے اپنے اہلِ خانہ کے بارے میں اندیشہ رہتا ہے

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

کہ نہ جانے میرے بعد ان کے ساتھ کیا ہو۔ ان احساسات کو زائل کرنے اور اس خوف سے امن و اطمینان پانے کے لیے وہ اپنے گھر والوں اور اپنے آپ کو خدا کی سپرداری میں دے دیتا ہے۔ اس طرح سے کہ وہ اللہ سے اپنے لیے سفر میں ہمراہی طلب کرتا ہے اور گھر والوں کے لیے محافظت و نگرانی کی فریاد کرتا ہے۔

آخر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا کی کہ اے اللہ ہم سفر کی مشقت، غم ناک مناظر، اور واپسی پر گھر میں اہل و عیال اور مال و دولت میں ہر طرح کیخرابی سے تیری پناہ چاہتے ہیں۔

سفر کی مشقت سے صرف جسم کو تھکا دینے والی مشقت ہی مراد نہیں ہے، بلکہ اس میں وہ ذہنی تکان بھی شامل ہے، جو آدمی کو بڑے ارادوں کے باندھنے اور طویل سفر جیسے ہمت آزما معاملات میں دل شکستگی کا باعث بنتی ہے۔ غم ناک مناظر سے مراد سفر کے دوران میں پیش آنے والے حادثات ہیں، جن کا تعلق مسافر، اس کے اہلِ خانہ اور اس کے ہم سفروں سے ہے۔ اور واپسی پر اہلِ خانہ کی طرف سے کسی اندوہ ناک خبر کا پانا یا امر کا دیکھنا بھی اس میں شامل ہے۔

واپسی پر گھر کی خرابی کی وضاحت خود دعا ہی میں کر دی گئی ہے کہ ہم اہلِ خانہ اور مال و منال میں واپسی پر کوئی خرابی نہ پائیں اور ان کے بارے میں کوئی نقصان کی خبر نہ سنیں۔ یہ خرابی یا نقصان اللہ کی طرف سے بھی ہو سکتا ہے اور واپسی کے لیے ہمارے غلط فیصلے اور طریقے کی وجہ سے بھی۔ مراد یہ ہے کہ ہمیں اس سفر سے اس وجہ سے واپس نہ آنا پڑے کہ ہمیں گھر سے کسی کی وفات کی خبر ملے۔ یا پردیس میں کاروباری نقصان کی وجہ سے واپس جانا پڑے یا ہماری واپسی کا طریقہ اور فیصلہ ایسا ہو کہ ہمیں یہ نقصانات اٹھانا پڑیں۔

سفر کے موقع پر یہ دعا نہایت جامع و مانع ہے۔ اس میں سفر سے متعلق کم و بیش ہر پہلو سے دعا مانگی گئی ہے۔ دینی و دنیوی شر سے خدا کی پناہ طلب کی گئی ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ سفر پر نکلتے وقت مسافر کے ذہن کی تیاری کی گئی ہے کہ کیسے مسائل سفر میں پیش آسکتے ہیں اور ان سب میں سہارا اگر کوئی ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ والا صفات کا ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

جاوید احمد غامدی

# قانون سیاست

(۲)

[ نئی اشاعت کے لیے مصنف کی طرف
سے نظرِ ثانی اور ترمیم و اضافہ کے بعد ]

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

## ۲۔ اصل ذمہ داری

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۙ وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًاۢ بَصِيْرًا. (النساء ۴:۵۸)

''اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے حق داروں کو ادا کرو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو۔ نہایت عمدہ بات ہے یہ جس کی اللہ تمھیں نصیحت کرتا ہے۔ بے شک اللہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔''

سورۂ نساء میں جہاں اللہ اور رسول اور اولوالامر کی اطاعت کا وہ بنیادی اصول بیان ہوا ہے جس کی وضاحت ہم نے اوپر کی ہے، اس سے متصل پہلے یہ آیت اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ اس اصول کی بنیاد پر جو ریاست قائم ہو گی اس کی اصل ذمہ داری یہی ہے کہ اسے عدل و انصاف کو ہر سطح پر اور اس کی آخری صورت میں قائم کر

دینے کی جدوجہد کرنی ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی اس آیت کی تفسیر میں 'واذا حکمتم بین الناس' کے تحت لکھتے ہیں:

"یہ امانت کے سب سے اہم پہلو کی تفصیل بھی ہے اور اقتدار کے ساتھ جو ذمہ داری وابستہ ہے، اس کی وضاحت بھی۔ جن کو اللہ تعالیٰ اپنی زمین میں اقتدار بخشتا ہے، ان پر اولین ذمہ داری جو عائد ہوتی ہے وہ یہی ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان پیدا ہونے والے جھگڑوں کو عدل وانصاف کے ساتھ چکائیں۔ عدل کا مطلب یہ ہے کہ قانون کی نگاہ میں امیر و غریب، شریف و وضیع، کالے اور گورے کا کوئی فرق نہ ہو۔ انصاف خریدنی و فروختنی چیز نہ بننے پائے۔ اس میں کسی جنبہ داری، کسی عصبیت، کسی سہل انگاری کو راہ نہ مل سکے۔ کسی دباؤ، کسی زور واثر اور کسی خوف و طمع کو اس پر اثرانداز ہونے کا موقع نہ ملے۔

جن کو بھی اللہ تعالیٰ نے زمین میں اقتدار بخشا ہے، اسی عدل کے لیے بخشا ہے۔ اس وجہ سے سب سے بڑی ذمہ داری اسی چیز کے لیے ہے۔ خدا کے ہاں عادل حکمران کا اجر بھی بہت بڑا ہے اور غیر عادل کی سزا بھی بہت سخت ہے۔ اس وجہ سے تنبیہ فرمائی ہے کہ یہ بہت ہی اعلیٰ نصیحت ہے جو اللہ تعالیٰ تمھیں کر رہا ہے، اس میں کوتاہی نہ ہو۔ آخر میں اپنی صفاتِ سمیع و بصیر کا حوالہ دیا ہے کہ یاد رکھو کہ خدا سب کچھ سنتا اور دیکھتا ہے، کوئی مخفی سے مخفی ناانصافی بھی اس سے مخفی رہنے والی نہیں۔" (تدبرِقرآن ج ۲ ص ۳۲۳)

صحابۂ کرام نے جب روم وایران کی سلطنتوں پر تاخت کی تو یہی حقیقت ہے جسے ان الفاظ میں بیان فرمایا کہ ہم اس دعوت کے ساتھ اٹھے ہیں کہ تم میں سے جو چاہے انسانوں کی بندگی سے نکل کر خدا کی بندگی اور دنیا کی تنگی سے نکل کر اس کی وسعت کی طرف اور ادیان کے ظلم سے نکل کر اسلام کے عدل کی طرف آجائے[1]۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی کے پیشِ نظر اصرار فرمایا کہ ریاست کا کوئی منصب کسی ایسے شخص کو نہ دیا جائے جو اس کا حریص ہو، اس لیے کہ اس سے پھر معاملات میں عدالت کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ آپ کا ارشاد ہے:

انا، واللہ، لانولی علی ھذا العمل احداً سالہ ولا احداً حرص علیہ. (مسلم، کتاب الامارہ)

"ہم بخدا، کسی ایسے شخص کو اس نظام میں کوئی منصب نہ دیں گے جو اسے مانگے اور اس کے لیے حریص ہو۔"

---

۱۔ تاریخ الامم والملوک، ابنِ جریر الطبری، ج ۴، ص ۱۰۷۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

صحابہ کو بھی آپ نے نصیحت کی کہ وہ اس معاملے میں خدا سے ڈرتے رہیں اور امارت کے طالب نہ بنیں، آپ نے فرمایا:

لا تسأل الامارة فانک ان اعطیتها عن مسألة وکلت الیها و ان اعطیتها عن غیر مسألة اعنت علیها.

(مسلم کتاب الامارہ)

''امارت کے طالب نہ بنو۔ اگر یہ تمھاری خواہش کے نتیجے میں تمھیں دی گئی تو تم اسی کے حوالے کر دیے جاؤ اور اگر بغیر خواہش کے حاصل ہوئی تو اللہ کی طرف سے اس میں تمھاری مدد کی جائے گی۔''

چنانچہ تاریخ گواہی دیتی ہے کہ اسی عدل کو قائم کر دینے کے لیے خلفاے راشدین نے اپنے دروازے فریاد اور اعتراض کرنے والوں کے لیے ہمیشہ کھلے رکھے، فقیرانہ زندگی اختیار کی، یہاں تک کہ پیوند لگے کپڑے پہنے، بوریے کو تخت بنایا اور اپنے عوام کے اندر انھی کی طرح اور انھی کے معیار پر اس طرح جیے کہ زمین و آسمان پکار اٹھے:

سلطنتِ اہلِ دل فقر ہے، شاہی نہیں

(باقی)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

جاوید احمد غامدی

# خورونوش میں حلت وحرمت

(۱)

دین چونکہ ہر پہلو سے نفسِ انسانی کا تزکیہ چاہتا ہے، اس لیے اُسے اس بات پر ہمیشہ اصرار رہا ہے کہ باطن کی تطہیر کے ساتھ کھانے اور پینے کی چیزوں میں بھی خبیث و طیب کا فرق ہر حال میں ملحوظ رہنا چاہیے۔ سدھائے ہوئے جانوروں کے شکار سے متعلق ایک سوال کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے بطور قاعدہ کلیہ کے فرمایا ہے کہ: 'احل لکم الطیبات'[۱]، (تمھارے لیے سب پاکیزہ چیزیں حلال ہیں)۔ اس سے یہ بات آپ سے آپ واضح ہوئی کہ خبائث ہر حال میں ممنوع ہیں۔ یہود و نصاریٰ نے اس معاملے میں افراط و تفریط کا جو رویہ اختیار کیا، اس کے پیشِ نظر اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر انھیں ایمان کی دعوت دیتے ہوئے یہی حقیقت اس طرح بیان فرمائی ہے:

وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ.(الاعراف ۷:۱۵۷)

"(یہ پیغمبر) اُن کے لیے طیبات کو حلال اور خبائث کو حرام ٹھیراتا ہے اور اُن کے وہ بوجھ اتارتا اور بندشیں توڑتا ہے جو اب تک ان پر رہی ہیں۔"

ان طیبات و خبائث کی کوئی جامع و مانع فہرست شریعت میں کبھی پیش نہیں کی گئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ

۱۔ المائدہ ۵:۴۔

انسان کی فطرت اس معاملے میں بالعموم اس کی صحیح رہنمائی کرتی ہے اور وہ بغیر کسی تردد کے فیصلہ کر لیتا ہے کہ کیا چیز طیب اور کیا خبیث ہے۔ وہ ہمیشہ سے جانتا ہے کہ شیر، چیتے، ہاتھی، چیل، کوے، گد، عقاب، سانپ، بچھو اور خود انسان کوئی کھانے کی چیز نہیں ہے۔ اسے معلوم ہے کہ گھوڑے اور گدھے دستر خوان کی لذت کے لیے نہیں، سواری کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ ان جانوروں کے بول و براز کی نجاست سے بھی وہ پوری طرح واقف ہے۔ نشہ آور چیزوں کی غلاظت کو سمجھنے میں بھی اس کی عقل عام طور پر صحیح نتیجے پر ہی پہنچتی ہے۔ چنانچہ خدا کی شریعت نے اس معاملے میں انسان کو اصلاً اس کی فطرت ہی کی رہنمائی پر چھوڑ دیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کچلی والے درندوں، چنگال والے [2] پرندوں، جلالہ [3] اور پالتو گدھے [4] وغیرہ کا گوشت کھانے کی جو ممانعت روایت ہوئی ہے، وہ اسی فطرت کا بیان ہے۔ شراب کی ممانعت سے متعلق قرآن کا حکم بھی اسی قبیل سے ہے۔ لوگوں نے جب زمانۂ نزولِ قرآن میں اس سے متعلق بعض فوائد کے پیشِ نظر بار بار پوچھا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس کا گناہ ان فوائد سے زیادہ ہے [5]۔ پھر سورۂ مائدہ میں پوری صراحت کے ساتھ یہ حقیقت واضح کر دی کہ یہ شیطان کی نجاست ہے جس سے ہر صاحبِ ایمان کو بچنا چاہیے۔

| | |
|---|---|
| يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ. | ”ایمان والو، یہ شراب اور جوا اور تھان اور قسمت کے تیر، سب گندے شیطانی کام ہیں، اس لیے ان سے الگ رہو تاکہ تم فلاح پاؤ۔“ |

(۵:۹۰)

یہ سب بیانِ فطرت ہی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ انسان کی یہ فطرت کبھی کبھی مسخ ہو جاتی ہے، لیکن دنیا میں انسانوں کی عادات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ان کی ایک بڑی تعداد اس معاملے میں بالعموم غلطی نہیں کرتی۔ چنانچہ شریعت نے بھی اس طرح کی کسی چیز کو اپنا موضوع نہیں بنایا۔ اس باب میں شریعت کا موضوع صرف وہ جانور اور اُن کے متعلقات ہیں جن کی حلت و حرمت کا فیصلہ تنہا عقل و فطرت کی رہنمائی میں کر لینا انسانوں کے لیے

---

۲۔ مسلم، کتاب الصید، باب ۳۔

۳۔ النسائی، کتاب الضحایا، باب ۴۳۔ اس سے مراد وہ جانور ہے جو گندگی کھانے کی عادت کے باعث بدبودار ہو گیا ہو۔

۴۔ بخاری، کتاب الذبائح، باب ۲۸۔

۵۔ البقرہ ۲: ۲۱۹۔



www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ممکن نہ تھا۔ سؤر انعام کی قسم کے بہائم میں سے ہے، لیکن وہ درندوں کی طرح گوشت بھی کھاتا ہے، پھر اسے کیا کھانے کا جانور سمجھا جائے یا نہ کھانے کا؟ وہ جانور جنھیں ہم ذبح کر کے کھاتے ہیں، اگر تذکیے کے بغیر مر جائیں تو ان کا حکم کیا ہونا چاہیے؟ انھی جانوروں کا خون کیا ان کے بول و براز کی طرح نجس ہے یا اسے حلال و طیب قرار دیا جائے گا؟ یہ اگر اللہ کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کر دیے جائیں تو کیا پھر بھی حلال ہی رہیں گے؟ ان سوالوں کا کوئی واضح اور قطعی جواب چونکہ انسان کے لیے دینا مشکل تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں کے ذریعے سے اسے بتایا کہ سؤر، خون، مردار اور خدا کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیے گئے جانور بھی کھانے کے لیے پاک نہیں ہیں اور انسان کو ان سے پرہیز کرنا چاہیے۔ اس معاملے میں شریعت کا موضوع اصلاً یہ چار ہی چیزیں ہیں۔ قرآن نے بعض جگہ 'قل لا اجد فیما اوحی الی' اور بعض جگہ 'انما' کے الفاظ میں پورے حصر کے ساتھ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف یہی چار چیزیں حرام قرار دی ہیں۔ ذیل میں ہم اس باب کے نصوص کی وضاحت کریں گے۔

قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ. (الانعام ۶:۱۴۶)

''کہہ دو، میں تو اس وحی میں جو میری طرف آئی ہے، کسی کھانے والے پر کوئی چیز جسے وہ کھاتا ہے، حرام نہیں پاتا سوائے اس کے کہ وہ مردار ہو یا بہایا ہوا خون یا سؤر کا گوشت، اس لیے کہ یہ سب ناپاک ہیں یا اللہ کی نافرمانی کرتے ہوئے اللہ کے نام کے سوا کسی اور کے نام کا ذبیحہ۔''

یہی حکم الفاظ کے معمولی تغیر کے ساتھ بقرہ (۲) کی آیات ۱۷۳-۱۷۴ اور نحل (۱۶) کی آیت ۱۱۵ میں بھی بیان ہوا ہے۔ پھر سورۂ مائدہ میں اللہ تعالیٰ نے اس کے بعض پہلوؤں کی وضاحت فرمائی ہے۔

اس میں پہلی چیز 'میتة' ہے۔ اس کے بارے میں یہ شبہ بعض ذہنوں میں پیدا ہو سکتا تھا کہ طبعی موت سے مرے ہوئے اور ناگہانی حوادث سے مرے ہوئے جانور میں کیا کچھ فرق کیا جائے گا یا دونوں یکساں مردار قرار پائیں گے؟ قرآن نے جواب دیا ہے کہ دونوں کا حکم ایک ہی ہے۔ اسی طرح کسی درندے کا پھاڑا ہوا جانور بھی مردار ہے الا یہ کہ تم نے اسے زندہ پا کر ذبح کر لیا ہو۔ ارشاد فرمایا ہے:

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ وَالْمُنْخَنِقَةُ

''تم پر مردار اور خون اور سؤر کا گوشت اور غیر اللہ کے نام کا ذبیحہ حرام ٹھیرایا گیا ہے اور

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

وَالْمَوْقُوْذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيْحَةُ وَمَآ اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ.(المائدہ۵:۳)

(اِسی کے تحت) وہ جانور بھی جو گلا گھٹنے سے مرا ہو، جو چوٹ سے مرا ہو، جو اوپر سے گر کر مرا ہو، جو سینگ لگ کر مرا ہو، جسے کسی درندے نے پھاڑ کر کھایا ہو سوائے اُس کے جسے تم نے زندہ پا کر ذبح کر لیا۔"

(باقی)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

سید وصی مظہر ندوی

# غیر مسلم حکومت میں مسلم اقلیت کا دعوتی کردار

(۲)

اس موضوع سے متعلق ''اشراق'' کا نقطۂ نظر ہمارے قارئین پر واضح ہے۔ مولانا وصی مظہر صاحب ندوی نے اپنے اس مضمون میں ایک دوسری رائے پیش فرمائی ہے۔ اپنے قارئین کی تعلیم کے لیے ہم اسے بغیر کسی نقد کے یہاں شائع کر رہے ہیں۔ (مدیر)

## دعوت پھیلانے کے وسائل

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دعوت کو پھیلانے اور پہنچانے کے لیے اپنے زمانے کے تمام وسائل کو استعمال کیا اور اخلاقی حدود میں رہتے ہوئے ہر ممکن طریقے کو آزمایا۔ چنانچہ آپ نے:

(الف) اپنے رشتہ داروں اور احباب سے تنہائی میں ملاقاتیں کر کے ان کے سامنے اپنا پیغام پیش کیا۔

(ب) اجتماعی طور پر ان کو کھانے پر بلا کر اپنی دعوت پیش کی۔

(ج) مختلف معاشرتی اجتماعات میں پہنچ کر حتیٰ کہ میلوں، ٹھیلوں اور بازاروں میں جا کر اسلام کی دعوت پہنچائی۔

(د) عام اجتماعات کے ذریعے سے بھی آپ نے پوری قوم کے سامنے اپنی دعوت کو پیش کیا، جس کی مثال ابو قبیس پہاڑ کے دامن میں قریش کے اجتماعِ عام سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خطاب ہے۔

(ح) مدینہ پہنچ کر آپ نے خطوط اور سفیروں کے ذریعے سے بھی اپنی دعوت پہنچائی۔

دورِ حاضر کے حالات اور وسائل کو دیکھتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اسوہ کے مطابق غیر مسلم حکومتوں میں بسنے والے مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ:

۱۔ اپنی جملہ سرگرمیوں میں اسلام کی دعوت کو سب سے زیادہ اہمیت دیں۔

۲۔ ہر مسلمان اپنے علم اور ذاتی صلاحیت کے مطابق دعوت و تبلیغ کا فرض ادا کرے۔

۳۔ اجتماعی طور پر مبلغین کو تیار کرنے کے ادارے قائم کیے جائیں۔

۴۔ حالات اور ماحول کے مطابق مختلف طبقات کے لیے تبلیغی لٹریچر تیار کر کے پھیلایا جائے۔

۵۔ آڈیو اور وڈیو کیسٹوں سے کام لیا جائے۔ جہاں ممکن ہو ریڈیو اور ٹی وی کے چینل حاصل کیے جائیں اور انٹرنیٹ سے بھی استفادہ کیا جائے۔

۶۔ مختلف علاقوں اور طبقوں کے لیے دعوتی وفود ترتیب دیے جائیں۔

۷۔ چھوٹے بڑے دعوتی اجتماعات منعقد کئے جائیں۔

تاہم اس دعوت کے پھیلانے کا کوئی مادی معاوضہ طلب نہیں کرنا چاہیے کیونکہ کسی نوع کا معاوضہ لینے کے بعد داعی کی آواز بے اثر یا کم اثر ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ مجید میں اکثر انبیا علیہم السلام کا یہ قول نقل کیا گیا ہے:

وَمَآ اَسۡـَٔلُكُمۡ عَلَيۡهِ مِنۡ اَجۡرٍ ۚ اِنۡ اَجۡرِىَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ. (الشعراء ۲۶: ۱۰۹، ۱۲۷، ۱۴۵، ۱۶۴، ۱۸۰)

”میں تم سے اس (دعوت) پر کوئی اجر یا بدلہ نہیں مانگتا میرا اجر تو صرف رب العالمین کے ذمہ ہے۔“

مادی معاوضہ نہ سہی بعض حضرات کے سامنے شہرت، نام وری، قوم کی ستایش یا ووٹوں کا حصول وغیرہ مقاصد ہو سکتے ہیں۔ لیکن یہ بھی دنیوی اجر کے طلب کی مختلف شکلیں ہیں۔ داعی کو ان سب چیزوں سے اپنا دامن پاک رکھنا چاہیے۔

## اجتماعیت کی ضرورت

دعوت کے اس عظیم الشان کام کے لیے ظاہر ہے کہ اجتماعی جدوجہد ضروری ہے نہ تو اس کام کو انجام دینے والے انفرادی طور پر اس کا حق ادا کر سکتے ہیں اور نہ کوئی فردِ واحد تنہا اس کام کو کامیابی کی منزل تک پہنچا سکتا ہے۔ لیکن اس اجتماعی جدوجہد کے سلسلہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا جو اسوہ ہمارے سامنے ہے وہ یہ ہے کہ آپ نے

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اپنے کام کا آغاز جماعت سازی یا تنظیم بنانے کی دعوت سے نہیں کیا بلکہ آپ نے صرف اپنی دعوت کو صاف صاف لوگوں کے سامنے پیش فرمایا۔ اس کی صداقت کے روشن دلائل دیے۔ اور اس دعوت کو پیش کرنے میں کسی کی مخالفت کی پروانہ کی۔ اس کے نتیجہ میں گنتی کے جو چند لوگ آپ پر ابتدا میں ایمان لائے ان سب کے اندر کم و بیش چند اوصاف موجود تھے۔

۱۔ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلیٰ اخلاقی کردار بالخصوص صداقت و امانت سے متاثر تھے۔

۲۔ ان کے اندر حق کو پہنچاننے کی صلاحیت اور پہچان کر اس کو قبول کرنے کی ہمت موجود تھی۔

۳۔ وہ جاہلی معاشرے سے وابستہ اپنے مفادات کو چھوڑ کر اس کی طرف سے ہر طرح کی مزاحمت اور مخالفت کو برداشت کرنے کا عزم رکھتے تھے۔

ان اوصاف کے ساتھ جب انھوں نے اسلام کی دعوت قبول کی تو معاشرے کی طرف سے ان پر لعنت ملامت، سب و شتم، تشدد اور ظلم و ستم کا سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔ ان حالات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف وہ تسلی کے لیے رجوع کرتے تو آپ ان کو کامیابی کی نوید سناتے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بشارتیں دیتے۔ مصائب میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کی تلقین کرتے۔ اور باہمی اخوت و محبت اور ایثار و غم خواری کی تعلیم دیتے۔ اس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کا محبت اور محبت کے ساتھ اطاعت کا تعلق قائم اور مستحکم ہوتا چلا گیا۔ اس سلسلہ میں سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا یہ ایثار ناقابل فراموش ہے کہ انھوں نے ایمان لانے والے متعدد مظلوم غلاموں کو منہ مانگے داموں پر خرید کر آزاد کیا تاکہ ان کو ناقابل برداشت مظالم سے بچایا جا سکے۔

علاوہ ازیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم مٹھی بھر ان ایمان لانے والوں کے ساتھ پہاڑوں اور گھاٹیوں میں نکل جاتے جہاں ان کے ساتھ نمازِ اشراق ادا کرتے یا یہ ایمان لانے والے دارِ ارقم میں مخفی طور پر آکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ملتے۔ اس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں ان کی اجتماعیت قائم اور مضبوط ہوتی چلی گئی۔

کسی ایسے معاشرے میں جہاں صرف ایک یا چند مسلمان ہی ہوں جماعت سازی کا یہی فطری طریقہ کار مناسب ہے اور اسی قسم کی اجتماعیت دعوت و تبلیغ کے فریضہ کو کامیابی سے ادا کر سکتی ہے۔ تاہم اگر دعوت کا کام کسی ایسے مسلم معاشرے میں کیا جائے جو اپنے فرائض سے منہ موڑ چکا ہو تو ان میں سے بہتر افراد کو تلاش کر کے ان کی جماعت بنانے میں مضائقہ نہیں تاکہ یہ جماعت دعوت کا کام انجام دے۔

جیسا کہ قرآنِ مجید سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جماعت ابتدا میں بنی اسرائیل کے صرف چند نوجوان کارکنوں پر مشتمل تھی۔

فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰٓی اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰی خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ.(یونس۱۰:۸۳)

''موسیٰ پر اس کی قوم کے صرف چند نوجوانوں نے اعتماد کر کے ان کا ساتھ دیا جبکہ ان کو فرعون اور خود اپنے ان سرداروں کی طرف سے (جو فرعون کے مقرب تھے) ڈر تھا کہ وہ (فرعون) ان کو ابتلا میں نہ ڈال دے۔''

اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام اگرچہ بنی اسرائیل کی طرف بھیجے گئے تھے چنانچہ وہ اسرائیل کی تمام ''کھوئی ہوئی بھیڑوں'' (گمراہ اسرائیلیوں) کو راہِ راست پر لانا چاہتے تھے۔ لیکن صرف چند حواری آپ پر ایمان لائے اور 'من انصاری الی اللہ'، (اللہ کی راہ اختیار کرنے میں میرا کون مدد گار بنے گا؟) کے جواب میں صرف ان حواریوں نے ہی کہا تھا 'نحن انصار اللہ' (ہم اللہ کے کام میں مدد کرنے والے ہیں) اور انھی مختصر افراد کو ساتھ لے کر ان دونوں اولوالعزم پیغمبروں نے اپنا فریضہ ادا کیا۔

تاہم یہ یاد رکھنا چاہیے کہ آج اس طرح کی کسی جماعت بن جانے کے بعد یہ کسی طرح جائز نہیں ہے کہ جو مسلمان اس جماعت میں شامل نہ ہوئے ہوں ان کو دائرۂ اسلام سے خارج سمجھ کر ان سے علیحدگی اختیار کر لی جائے، اپنے اور ان کے درمیان غیریت کی دیوار کھڑی کر لی جائے۔ یا ان کے مسائل سے صرفِ نظر کر لیا جائے کیونکہ اول تو خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اب کسی کا یہ مقام و مرتبہ ہی نہیں ہے کہ اس کا ساتھ نہ دینے والوں کو اسلام سے خارج سمجھا جائے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہم حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام جیسے جلیل القدر پیغمبروں کو دیکھتے ہیں کہ انھوں نے بنی اسرائیل کی طرف سے ہر زیادتی کے باوجود ان سے علیحدگی اختیار نہ کی۔ چنانچہ:

۱۔ حضرت موسیٰ کا ساتھ دینے والے اگرچہ صرف چند نوجوان تھے اور فرعون کے عوہ خود بنی اسرائیل کے بڑے بڑے سردار بھی ان نوجوانوں کے دشمن بنے ہوئے تھے۔ مگر حضرت موسیٰ نے تمام بنی اسرائیل کو فرعون کے پنجے سے نکالنے کی کوشش جاری رکھی اور بالآخر سب کو ساتھ لے کر مصر سے نکلے۔

۲۔ فرعون سے نجات پانے کے بعد جاہل اسرائیلیوں کی طرف سے عبادت کے لیے کوئی بت مہیا کرنے

کے مطالبے کے باوجود حضرت موسیٰ نے ان سے اعلانِ برأت نہیں کیا۔

۳۔ حضرت موسیٰ کی عدم موجودگی میں بہت سے اسرائیلیوں نے گئوسالہ پرستی اختیار کی۔

۴۔ اسی طرح حضرت موسیٰ نے احکامِ الٰہی کی تعمیل میں ان کی حیل و حجت کے باوجود جس کا مظاہرہ گائے ذبح کرنے کے حکم پر کیا گیا ان کا ساتھ نہ چھوڑا۔

اور جب تمام اسرائیلیوں نے بیت المقدس فتح کرنے کے لیے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کے ساتھ جانے سے صاف صاف انکار کر دیا اور حضرت موسیٰ نے سخت ناراض ہو کر ان سے علیحدگی کی درخواست بارگاہِ الٰہی میں پیش کر دی (فافرق بيننا و بين القوم الفسقين) تو اس وقت بھی اللہ تعالیٰ نے یہ تفریق قبول نہ فرمائی بلکہ صحرا نوردی کے چالیس سال میں حضرت موسیٰ کو بھی اپنی قوم ہی کے ساتھ رہنا پڑا۔

۵۔ اسی طرح سیدنا مسیح علیہ السلام نے بھی اسرائیل اور بالخصوص ان کے علما اور راہبوں کی طرف سے سخت مخالفت کے باوجود خود ان سے اعلانِ برأت نہیں کیا۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر آج اسلامی دعوت کو پھیلانے اور اس کو کامیابی سے ہم کنار کرنے کے لیے کوئی تنظیم قائم ہو اور ظاہر ہے تنظیم کے بغیر یہ کام نہیں ہو سکتا تو:

۱۔ اس تنظیم کو دوسرے مسلمانوں سے نہ علیحدگی اختیار کرنی چاہیے نہ غیریت کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔

۲۔ بلکہ اگر کچھ دوسرے لوگ یا تنظیمیں دعوتِ اسلامی کے لیے خود اپنے طور پر کام کر رہے ہوں تو ان کے خلاف محاذ آرائی نہیں کرنی چاہیے۔ بلکہ ان کے کام کو بھی اپنا کام سمجھ کر اس کی قدر کرنی چاہیے کہ یہ لوگ دعوت کے ان پہلوؤں پر کام کر رہے ہیں یا ان طریقوں کو استعمال کر رہے ہیں جن پہلوؤں پر یا جن طریقوں سے ان کی تنظیم کام نہیں کر رہی ہے۔

مسلمانوں کی مختلف جماعتیں جو دعوتِ اسلامی کا کام کرتی ہوں اگر اس جذبہ اور اس ذہنیت کے ساتھ کام کریں گی جن کا ابھی ذکر کیا گیا تو توقع یہ ہے کہ ان کے درمیان اتحاد و تعاون کا تعلق قائم ہو گا اور اس کی وجہ سے ان کے درمیان بہت جلد اتحاد سے آگے بڑھ کر ایک دوسرے کے ساتھ مدغم ہو جانے کا عمل شروع ہو جائے گا۔

## تربیت

دعوت اور تنظیم کے بعد تنظیم میں شریک ہونے والوں کی تربیت کی ذمہ داری بہت اہم ہے۔ اس کی وجہ یہ

ہے کہ داعی کے لیے دعوت کو قبول کرنے والے افراد بہت قیمتی سرمایہ ہوتے ہیں۔ کیونکہ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنی برتر عقلی صلاحیت کی وجہ سے باطل کے گھٹاٹوپ اندھیرے میں حق کو پہچان کر قبول کیا اور جنھوں نے نظامِ باطل سے وابستہ مفادات کو ٹھکرا کر حق کو قبول کیا نیز جس حق پر وہ ایمان لائے ہیں اس کے تقاضوں کے مطابق اپنی زندگی میں تغیر پیدا کرنے کے لیے ہمہ تن تیار ہو گئے۔

اس لیے داعی ان ایمان لانے والوں کی تیاری اور تربیت کی طرف خصوصی توجہ دیتا ہے کہ یہی وہ پنیری ہے جس سے اسلام کا سرسبز باغ تیار ہو گا۔ اس تربیت کے لیے اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جو خصوصی ہدایات جاری فرمائی اور اہلِ ایمان کی تربیت کے لیے جو مفصل پروگرام حوالے کیا اس کے اہم اجزا درج ذیل ہیں:

## توجہ اور صحبت

اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی کہ وہ اہلِ ایمان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزاریں تاکہ ان کی تربیت کا کام اچھی طرح ہو سکے۔ ارشاد ہوا:

وَاصۡبِرۡ نَفۡسَكَ مَعَ الَّذِيۡنَ يَدۡعُوۡنَ رَبَّهُمۡ بِالۡغَدٰوةِ وَالۡعَشِيِّ يُرِيۡدُوۡنَ وَجۡهَهٗ وَلَا تَعۡدُ عَيۡنٰكَ عَنۡهُمۡ ۚ تُرِيۡدُ زِيۡنَةَ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا. (الکہف ۱۸:۲۸)

”اور اللہ کی رضا چاہتے ہوئے جو لوگ اپنے رب کو صبح و شام پکارتے ہیں۔ ان کے ساتھ خود کو روکے رکھو اور دنیا کی زینت کی طلب میں اپنی آنکھیں ان سے آگے نہ لے جاؤ۔“

اس حکم کی تعمیل کرتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کی وادیوں اور پہاڑوں میں اہلِ ایمان کے ساتھ نمازِ اشراق اور نماز باجماعت کا اہتمام کیا۔ قرآنِ مجید کے نازل ہونے والے حصوں کو پڑھ کر سنایا اور ان کو زبانی یاد کرنے کی ترغیب دی۔ علاوہ ازیں دارِ ارقم میں طویل قیام کر کے اہلِ ایمان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارا۔

## نماز

تربیتی ہدایات کا دوسرا جز نماز ہے اس سلسلہ میں جو ہدایات دی گئی اس میں نمازِ تہجد کی سب سے زیادہ تاکید کی گئی۔ جو رات کے پچھلے حصہ میں اٹھ کر پڑھی جاتی ہے اس نماز کے لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وہ نفس کے دبانے اور کچلنے میں بہت زیادہ موثر ہے۔ اس ہدایت پر ایمان لانے والے صحابہ اور خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کس



www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

طرح عمل کرتے تھے اس کا ذکر قرآنِ مجید میں یوں کیا گیا ہے:

اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ.(المزمل۷۳:۲۰)

”بے شک تمھارا رب جانتا ہے کہ تم اور جو لوگ تمھارے ساتھ ایمان لائے ہیں۔ان میں سے ایک گروہ دو تہائی رات کے قریب یا نصف رات یا ایک تہائی رات (نماز میں) کھڑے رہتے ہیں۔“

## زکوٰۃ

تربیتی پروگرام کا تیسرا جز زکوٰۃ کی ادائیگی یا اللہ کی راہ میں مالی قربانی دینا ہے اس کی بھی بڑی تاکید ہے۔کیونکہ انسان کا مال جہاں ہوتا ہے وہیں اس کا دل ہوتا ہے اگر وہ اپنا مال اللہ کے ہاں جمع کرے گا تو اس کا دل بھی اللہ ہی کی طرف لگا رہے گا۔

وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ.(البقرہ۲:۸۳)

”اور لوگوں سے بھلی بات کہو (توحید کی دعوت دو) اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو۔“

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

## قرآنِ حکیم کی تعلیم

تربیتی پروگرام کا چوتھا جز قرآنِ حکیم کی تعلیم ہے۔اس سلسلہ میں ارشاد ہے:

وَاتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ.(الکہف۱۸:۲۷)

”اور اپنے رب کی کتاب جو تمھاری طرف وحی کی گئی ہے پڑھ کر سناؤ۔“

اسی طرح فجر کے وقت قرآنِ مجید پڑھنے کی اہمیت کو اس طرح واضح کیا گیا ہے۔

وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ؕ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا.(بنی اسرائیل۱۷:۷۸)

”اور فجر کے وقت قرآن پڑھو بے شک فجر کے وقت قرآن پڑھنا حضوری والا ہے۔“

سب سے اہم بات یہ ہے کہ تعلیمِ کتاب (قرآن) و تعلیمِ حکمت کو اللہ تعالیٰ نے متعدد آیات میں مقاصدِ بعثت میں شامل فرمایا ہے۔مثلاً:

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ

”وہی ہے جس نے امیوں میں سے ایک رسول انھی میں سے اٹھایا وہ ان کو اس کی آیات

وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ. (الجمعہ ۶۲:۲)

پڑھ کر سناتا ہے ان کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔"

## اہلِ خاندان کی تربیت

تربیتی پروگرام کا ایک پانچواں جز بھی ہے۔ مکہ میں اسلام کی دعوت پھیلانے کے ابتدائی زمانے میں جس کی زیادہ ضرورت محسوس نہ ہوئی تھی۔ لیکن بعد میں جب اسلامی معاشرہ قائم ہو گیا تو اس کی طرف خصوصی توجہ دی گئی اور وہ ہے اولاد اور دیگر اہلِ خاندان کی اسلامی تربیت تاکہ وہ بھی اچھے مسلمان بن کر اٹھیں۔ اس سلسلہ میں قرآنِ مجید نے حکم دیا ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ. (التحریم ۶۶:۶)

"اے لوگو، جو ایمان لائے ہو اپنے آپ کو اور اپنے خاندان کو اس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں۔"

علاوہ ازیں قرآن کی متعدد آیات میں واضح کیا گیا ہے کہ اگر اولاد، والدین، بیوی اور شوہر اچھے اور نیک ہوں گے تو جنت میں ان کو ایک ہی جگہ رکھا جائے گا۔

ایک موقع پر حاملِ عرش فرشتوں کی دعا ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے:

رَبَّنَا وَاَدْخِلْهُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ اِلَّتِيْ وَعَدْتَّهُمْ وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ. (المؤمن ۴۰:۸)

"اے ہمارے رب اور ان کو ہمیشگی کے باغات میں داخل کر اور ان کو بھی جو صالح بن جائیں۔ ان کے باپ ان کی ازواج اور اولاد میں سے۔"

اس تربیتی پروگرام سے غیر مسلم حکومتوں میں بسنے والی مسلم اقلیت کو یہ رہنمائی ملتی ہے کہ:

بچوں اور خواتین کی اسلامی تعلیم و تربیت کا خصوصی اہتمام کیا جائے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تو نبوت سے پہلے کی اپنی زندگی کو بھی تمام لوگوں کے سامنے پیش فرمایا ہے۔

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ط اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ. (یونس ۱۰:۱۶)

"تو یقیناً میں تمھارے اندر اس سے پہلے بھی ایک عمر گزار چکا ہوں تو کیا تم سمجھتے نہیں ہو۔"

دعوت پہنچانے کے سلسلہ میں دوسرا نکتہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوت کی صداقت ثابت کرنے کے لیے معجزات کا سہارا نہیں لیا. بلکہ دعوت کے ہر پہلو کو دل نشیں دلائل کے ساتھ لوگوں کے سامنے

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

پیش کیا چنانچہ لوگوں کی عقل و فہم کی قوت و صلاحیت کو مخاطب کرتے ہوئے بار بار فرمایا:

اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّتَفَکَّرُوۡنَ. (الرعد۱۳:۳)
”بے شک اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کریں۔“

اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ. (الانبیا۲۱:۶۷)
”تو کیا تم سمجھتے نہیں ہو۔“

فَاَنّٰی یُؤۡفَکُوۡنَ. (الزخرف۴۳:۸۷)
”پھر تم کو کدھر بھٹکایا جا رہا ہے۔“

کفار کی طرف سے معجزات کے مطالبے کے جواب میں آپ نے قرآنِ حکیم کو بطور معجزہ پیش کرتے ہوئے فرمایا:

اَوَلَمۡ یَکۡفِہِمۡ اَنَّاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ یُتۡلٰی عَلَیۡہِمۡ. (العنکبوت۲۹:۵۱)
”کیا ان (کافروں) کے لیے یہ بات کافی نہیں ہے کہ ہم نے تم پر کتاب نازل کی جو ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہے۔“

تیسرا نکتہ یہ ہے کہ داعی کو تشدد سے اجتناب کرنا چاہیے اور جس معاشرے میں وہ رہ رہا ہو اس کے قانون کی پابندی کرنی چاہیے چنانچہ:

## تشدد سے اجتناب اور قانون کی پابندی

مکی زندگی میں مسلمانوں کو جو احکام دیے گئے ان میں سے ایک اہم حکم یہ تھا کہ ان پر خواہ کتنے مظالم کے پہاڑ توڑے جائیں مگر وہ صبر، درگزر اور تحمل سے کام لیں۔ ان کو طاقت کے جواب میں طاقت استعمال کرنے کی اجازت نہ تھی۔ حالانکہ ان کے اندر حضرت حمزہ اور حضرت عمیر جیسے بہادر بھی موجود تھے۔ اور مسلمانوں کے پاس وہی ہتھیار بھی تھے جو ان کے دشمنوں کے پاس تھے۔ اس زمانے میں تیر، تلوار، اور خنجر ایسے ہتھیار تھے جو تمام عرب بالعموم رکھتے تھے۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ کسی قائم شدہ حکومت کے اندر رہتے ہوئے اس کے خلاف طاقت کا استعمال فساد فی الارض کا موجب ہے جس کو اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو صبر کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا:

لَتُبۡلَوُنَّ فِیۡۤ اَمۡوَالِکُمۡ وَاَنۡفُسِکُمۡ قف وَلَتَسۡمَعُنَّ مِنَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ وَمِنَ الَّذِیۡنَ اَشۡرَکُوۡۤا اَذًی
”تمھارے مالوں اور جانوں کے سلسلہ میں تمھاری ضرور آزمایش کی جائے گی۔ اور تم کو اہل کتاب اور مشرکین کی طرف سے نہایت

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

كَثِيْرًا ؕ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ. (آل عمران ۳:۱۸۶)

تکلیف دہ (باتیں) سننی پڑیں گی اور اگر تم صبر اور تقویٰ اختیار کرو گے تو یہی پختہ عزم کی بات ہے۔''

اسی قسم کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمار بن یاسر اور ان کے اہلِ خاندان پر ظلم ہوتے ہوئے دیکھ کر ان سے کہا تھا:

اصبرو آل یاسر فان موعدکم الجنة.

''اے آل یاسر، صبر سے کام لو کیونکہ تم سے ملاقات جنت میں ہو گی۔''

مکہ میں صبر و تحمل کی یہ ہدایت اسی قسم کی ہدایت ہے جو سیدنا مسیح علیہ السلام نے اپنے شاگردوں کو دی تھی کہ:

''اگر کوئی تمھارے ایک گال پر تھپڑ مارے تو تم دوسرا گال بھی پیش کر دو اور اگر کوئی تم کو بیگار میں ایک کوس لے جانا چاہے تو تم دو کوس چلنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔''

مصائب اور تکالیف پر صبر کرنے کے سلسلہ میں سابقہ امتوں کو بھی اسی قسم کے احکام دیے گئے تھے۔

## آدابِ دعوت

اسلام کی دعوت و تبلیغ کے سلسلہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو طریقۂ کار اختیار فرمایا، اس کے اہم اور بنیادی نکات کو بھی اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے اور جس ماحول میں کوئی داعی فرد یا دعوت دینے والی تنظیم کام کر رہی ہو اس میں حتی الوسع ان نکات کو اپنے طریقۂ کار کا جز بنانا چاہیے۔ میں یہاں صرف چند اہم ترین نکات کی طرف اشارہ کروں گا۔

### ۱۔ ذاتی نمونہ و کردار

ان میں سے پہلا نکتہ یہ ہے کہ باطل نظریات پھیلانے کے لیے خواہ جھوٹ اور منافقت کا سہارا لیا جا سکتا ہو مگر اسلامی دعوت کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ داعی کا کردار اس کی دعوت سے پوری طرح ہم آہنگ ہو اور کردار کا آغاز اس بات سے ہوتا ہے کہ جس دعوت کو وہ لوگوں کے سامنے پیش کر رہا ہے اس کی سچائی پر وہ خود دل کی گہرائی سے یقین رکھتا ہو۔ اور اس دعوت کے خلاف کسی قسم کی ترغیب سے متاثر نہ ہو۔ نہ کسی کو راضی کرنے کے لیے اس دعوت سے انحراف کی کوئی صورت قبول کرے۔ اس سلسلہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

نے ہدایت فرمائی تھی۔

فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۚ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ.(الشوریٰ ۴۲:۱۵)

''لہٰذا اسی دین کی طرف تم دعوت دو۔ اور جس طرح تم کو حکم دیا گیا ہے اسی پر ثابت قدم رہو اور کہو کہ اللہ نے جو کتاب نازل کی میں اس پر ایمان لایا ہوں۔''

اس سلسلہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کفار نے کئی مصالحتی فارمولوں پر بات کی اور آپ کو اپنی دعوت کے سلسلہ میں کچھ نہ کچھ مداہنت یا نرمی پر راضی کرنا چاہا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ.

(القلم ۶۸:۹)

''انھوں نے چاہا تھا کہ تم مداہنت اختیار کرو تو بھی مداہنت سے کام لیں۔''

اسی طرح قرآنِ مجید نے کفار کی طرف سے دعوتِ دین اور حق کی تبلیغ میں ترمیم کرنے کے مطالبہ کا بھی ذکر کیا ہے:

قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ؕ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ.

(یونس ۱۰:۱۵)

''اور جو لوگ ہم سے ملاقات کی امید نہیں رکھتے، انھوں نے کہا کہ کوئی دوسرا قرآن لے آؤ یا اسی میں تبدیلی کر دو۔ کہہ دو کہ مجھے یہ اختیار نہیں ہے کہ میں اس میں اپنی طرف سے کوئی تبدیلی کر دوں۔''

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

دعوت کی سچائی پر داعی کے پختہ ایمان کے بعد ذاتی کردار اور ذاتی عمل کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام انبیا علیہم السلام نے مختلف انداز میں اپنی قوم کے سامنے یہ بات رکھی ہے کہ:

وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَآ اَنْهٰكُمْ عَنْهُ.(ہود ۱۱:۸۸)

''میں یہ نہیں چاہتا کہ جس چیز سے تم کو میں منع کر رہا ہوں اس کی خلاف ورزی میں خود کروں۔''

اپنے ذاتی نمونے کے ذریعے سے دعوت پیش کرنے کو اللہ تعالیٰ نے ''شہادت'' (گواہی) سے تعبیر فرمایا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

| | |
|---|---|
| وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا.(البقرہ۲:۱۴۳) | ”اور اسی طرح ہم نے تم کو امت وسط (بہترین امت) بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ بنو اور رسول تم پر گواہ بنے۔“ |
| اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ.(النساء۴:۷۷) | ”کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھ روکے رکھو، نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو۔“ |

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جب تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں رہے نہ آپ نے اپنا کوئی قانون الگ بنایا نہ الگ عدالتیں قائم کیں بلکہ اس قبائلی معاشرے میں جن احکام و قوانین پر عمل ہوتا تھا آپ نے کوئی مداخلت نہیں کی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے غلط رسوم و رواج پر سخت تنقید ضرور فرمائی مگر آپ نے کسی کو قانون شکنی کی ترغیب نہیں دی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اسوہ سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ کسی غیر مسلم حکومت میں رہنے والے مسلمانوں کو قانون شکنی کا راستہ اختیار نہ کرنا چاہیے اور جب تک وہ کسی ملک میں رہ رہے ہوں وہ اس کے ملکی قوانین کا احترام کریں۔

البتہ اگر کسی سرزمین میں اظہارِ رائے کی آزادی سرے سے سلب کر لی جائے۔ مذہب اور عقیدے کی بنا پر لوگوں کو ناقابل برداشت ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جائے اور مذہبی فرائض ادا کرنے سے بذریعہ طاقت روکا جائے تو مسلمان کو ایسی سرزمین میں رہتے ہوئے طاقت کا جواب طاقت سے دینے کے بجائے اس سرزمین کو چھوڑ دینا چاہیے۔

## ترکِ وطن یا ہجرت

اس ترکِ وطن یا ہجرت کی تین شکلیں ممکن ہیں:

### ۱۔ کسی غیر مقبوضہ علاقے کی طرف ہجرت

مثلاً مومن جبر و ظلم سے بچنے کے لیے کسی جنگل، پہاڑ یا وادی کی طرف چلا جائے جہاں پر کسی کا اقتدار نہ ہو یعنی وہ 'No Man's Land' ہو جیسا کہ اصحابِ کہف نے پہاڑ کے غار میں پناہ لینے کو ترجیح دی تھی۔ قرآنِ مجید میں اصحابِ کہف کا واقعہ تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ اس سلسلہ میں اصحابِ کہف کے باہمی مشورے کا ذکر کرتے

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

ہوئے ارشاد ہے کہ:

وَاِذِ اعۡتَزَلۡتُمُوۡهُمۡ وَمَا يَعۡبُدُوۡنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاْوٗۤا اِلَى الۡكَهۡفِ يَنۡشُرۡ لَكُمۡ رَبُّكُمۡ مِّنۡ رَّحۡمَتِهٖ وَيُهَيِّئۡ لَكُمۡ مِّنۡ اَمۡرِكُمۡ مِّرۡفَقًا. (الکہف ۱۸: ۱۶)

''اور جب ہم نے ان سے اور اللہ کے سوا ان کے جو معبود ہیں ان سے علیحدگی اختیار کر لی ہے تو چل کر غار میں پناہ لے لیں۔ اللہ تعالیٰ ہم کو اپنی رحمتوں سے ڈھانک لے گا۔ اور ہمارے کام میں آسانی پیدا فرمائے گا۔''

جن حالات میں اصحابِ کہف ہجرت پر مجبور ہوئے اس کا ذکر اصحابِ کہف کی زبان سے اس طرح کیا گیا ہے۔

اِنَّهُمۡ اِنۡ يَّظۡهَرُوۡا عَلَيۡكُمۡ يَرۡجُمُوۡكُمۡ اَوۡ يُعِيۡدُوۡكُمۡ فِىۡ مِلَّتِهِمۡ وَلَنۡ تُفۡلِحُوۡۤا اِذًا اَبَدًا. (الکہف ۱۸: ۲۰)

''بے شک وہ اگر ہمارا پتا لگانے میں کامیاب ہو گئے تو وہ ہم کو سنگ سار کر دیں گے یا ہمیں اپنی ملت کی طرف واپس جانے پر مجبور کر دیں گے۔''

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی قسم کے حالات میں اجازت دی ہے کہ مسلمان اپنی بھیڑ بکریاں لے کر پہاڑوں کی طرف نکل جائے تاکہ ظالموں کے شر سے محفوظ رہے اور اپنے دین کی حفاظت کرے۔

**۲۔ دارالامن کی طرف ہجرت**

ہجرت کی دوسری صورت یہ ہے کہ غیر مسلم اکثریت ہی کا کوئی ایسا ملک موجود ہو جہاں مسلمان آزادی سے اپنے دین پر عمل کر سکیں اور پر امن زندگی گزار سکیں۔ اس ہجرت کی مثال ہجرتِ حبشہ ہے جبکہ مکہ کے بعض مسلمانوں کے لیے ظلم وستم ان کی برداشت سے باہر ہو گیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حبشہ کے عیسائی بادشاہ کے عادلانہ اندازِ حکمرانی کی تعریف کرتے ہوئے ان کو حبشہ ہجرت کرنے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ مختلف اوقات میں تھوڑے تھوڑے کر کے ستر سے زائد مسلمان حبشہ ہجرت کر گئے۔

**۳۔ دارالاسلام کی طرف ہجرت**

ہجرت کی تیسری صورت یہ ہے کہ دنیا میں کوئی ایسی سرزمین موجود ہو یا مہیا ہو جائے جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہو۔ جہاں اسلامی احکام جاری ہوں یا ہو سکتے ہوں اور جہاں آزادی کے ساتھ ہر شخص اپنے عقیدے کے مطابق اپنے رب کی عبادت بجالائے۔ اس کی مثال مدینہ منورہ کی سرزمین ہے جہاں مسلمان مکہ سے ہجرت

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

کر کے گئے تھے۔

اس ہجرت سے پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حج کے موقع پر مدینہ کے نوجوان خفیہ طور پر آتے رہے اور یہاں اسلام قبول کر کے مدینہ میں اسلام کی دعوت پھیلاتے رہے۔ حتیٰ کہ وہاں کے ہر گھر میں کوئی نہ کوئی مسلمان ہو گیا۔ آخر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مصعب بن عمیر کو ان کے ساتھ مدینہ بھیجا تاکہ وہ ان مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کریں۔

پھر جب مدینہ کے حالات پوری طرح سازگار ہو گئے تو مکہ کے تمام مسلمان ہجرت کر کے مدینہ آ گئے سب سے آخر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی مدینہ تشریف لے آئے۔ نیز جو مسلمان حبشہ چلے گئے تھے وہ بھی مدینہ آ گئے۔

نوٹ: ہجرت کے بعد جو مراحل پیش آتے ہیں ان کے بارے میں بھی قرآن و سنت سے رہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے مگر ان مراحل پر بحث اس وقت میرے موضوع میں شامل نہیں ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

محمد ساجد خان خاکوانی

# امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ

سرکاری جاسوس، محکمہ شرطہ کے عمال اور کوتوالِ شہر کے کارندے گلی گلی، بازار بازار، کوچہ کوچہ اور گھر گھر ایسے افراد کی بو لیتے پھرتے ہیں جو خلیفۂ وقت کے عقیدہ خلقِ قرآن کی ذرا سی بھی مخالفت کرتا ہو۔ ایسے افراد ہر بستی اور ہر شہر سے گرفتار کر کے بے دریغ قتل کیے جارہے ہیں۔ بغداد کا قاضی خلیفہ مامون الرشید کو لکھتا ہے کہ یہاں ایک عالمِ دین اس عقیدہ کو قبول کرنے سے نہ صرف انکاری ہے بلکہ بڑی شد و مد سے اس کی مخالفت بھی کرتا ہے۔ خلیفہ اس عالمِ دین کو دربارِ خلافت میں پیش کرنے کا حکم دیتا ہے۔

۷۵ سالہ عالمِ پیری، جسم پر بڑھاپے کا غلبہ، چہرے پر نورانیت کی بارش، ہاتھوں میں ہتھکڑیاں، گلے میں طوق اور پاؤں میں بیڑیاں، آہنی زیور سے آراستہ اور قدموں میں پہاڑ جیسی استقامت، ''شاہی مجرم'' کی حیثیت سے امامِ عزیمت امام احمد بن حنبل سرکاری اہل کاروں کے جلو میں پھانسی کا پھندا چومنے جارہے ہیں۔ پورا شہر اس منظر کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرتا ہے۔

امام احمد بن حنبل مسلمانوں میں رائج مکاتبِ فکر میں سے دبستانِ حنبلی کے بانی ہیں۔ امت میں آپ کا تعارف فقیہ اور محدث دونوں حیثیتوں سے پایا جاتا ہے۔ فقہ میں آپ کا کارنامہ فقۂ حنبلی کا آغاز ہے، جبکہ مسندِ احمد آپ کی محدثانہ کاوش کا نتیجہ ہے۔ فقۂ حنبلی کی ابتدا بغداد سے ہوئی، ساتویں صدی ہجری تک یہ مصر میں بھی پھیل چکی تھی۔ اس کے بعد امتِ مسلمہ کے تقریباً ہر خطے میں اس کا نمو ہوا آج یہ فقہ جزیرۃ العرب میں رائج ہے۔

امام احمد بن حنبل ربیع الاول ۱۶۴ ہجری میں پیدا ہوئے۔ آپ کی تاریخِ وفات ۱۲ ربیع الاول ۲۴۱ ہجری ہے۔اس طرح ۷۷ سال کا عرصہ آپ نے اس عالمِ فانی میں گزارا۔ آپ بغداد میں پیدا ہوئے اور بغداد ہی میں دفن ہوئے۔ آپ کا جنازہ جمعہ کے روز پڑھا گیا اور ایک روایت کے مطابق ۷ لاکھ افراد اس میں شریک ہوئے۔ یہ متوکل علی اللہ عباس کا دورِ خلافت تھا۔ آپ کی وفات عالمِ اسلام کے لیے سانحۂ عظیم تھی۔

امام احمد قبیلہ عدنان کے شیبانی خاندان سے تعلق رکھتے تھے، اس طرح آپ کا نسب نامہ نزار بن معد ابنِ عدنان کے واسطے سے محسنِ انسانیت حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مل جاتا ہے۔ عہدِ جاہلیت میں یہ خاندان عراق کے قرب وجوار میں آباد تھا۔ امیر المومنین ابی حفص عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے جب شہر بصرہ آباد کیا تو یہ خاندان اس شہر میں آن بسا۔ چنانچہ روایت ہے کہ آپ بصری کہلاتے تھے اور جب بھی بصرہ جاتے تو اپنی آبائی مسجد میں نماز ادا کرتے۔

احمد بن حنبل سے شبہ ہوتا ہے کہ حنبل آپ کے والد کا نام ہے، یہ نام آپ کے دادا حنبل بن ہلال کا تھا جو اموی اقتدار میں صوبہ سرخس کے گورنر رہے تھے اور بعد میں عباسی تحریک سے منسلک ہو گئے۔ آپ کے والدِ محترم محمد بن حنبل بنیادی طور پر مجاہد تھے اور فوج میں بحیثیتِ کمان دار فرائض ادا کرتے رہے۔ امام احمد کی پیدائش سے قبل یہ خاندان بغداد منتقل ہو گیا۔ امام صاحب دو سال کے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ وراثت میں ملنے والی جائداد کے وسیلے سے والدہ نے آپ کی پرورش کی۔

امام صاحب کی سیرت و کردار میں حسبِ ذیل پانچ خصوصیات نے بہت اہم کردار ادا کیا۔

ا۔ حسب و نسب کا شرف

آپ ماں باپ دونوں کی طرف سے خالص عربی تھے۔

ب۔ یتیمی

ابتدا ہی سے یتیمی کے کڑے امتحان نے آپ کو اعتمادِ نفس عطا کیا۔

ج۔ شجاعت

یہ آپ کے قبیلہ کا خاصہ تھا۔

د۔ قناعت

جس نے آپ کے اندر فکر و نظر کی بلندی پیدا کی۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

و۔ تقویٰ

جس کی وجہ سے آپ بہت مشکل وقت میں بھی ثابت قدم رہے۔

امام احمد رحمہ اللہ کی پرورش، تربیت اور ابتدائی تعلیم بغداد ہی میں ہوئی۔ آپ کا خاندان بالعموم اور والدہ محترمہ بالخصوص آپ کو عالمِ دین بنانا چاہتے تھے۔ بہت چھوٹی عمر میں قرآن حفظ کر لیا اور پھر تحریر و کتابت کے فن سے آشنائی حاصل کی۔ چودہ سال کی مختصر عمر میں آپ اس مرحلے میں داخل ہو گئے جہاں باقاعدہ کسی ایک میدان میں علم و فن کا انتخاب کرنا تھا۔

بغداد دنیاے علم کا مرکز و محور تھا۔ یہاں دینی اور دنیوی دونوں علوم رائج تھے۔ دنیوی علوم میں لغت، طب، نجوم، فلسفہ، جغرافیہ، ہندسہ، الجبرا، تاریخ، سیاحت اور خطابت وغیرہ تھے۔ جبکہ دینی علوم میں تفسیر، حدیث، اصول، فقہ، کلام، افتا اور روایت وغیرہ شامل تھے۔ امام صاحب رحمہ اللہ نے اپنی طبیعت اور تربیت کے پیشِ نظر دینی علوم کی طرف توجہ کی اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے حلقہ میں فقہ کا درس لینے لگے۔

کچھ ہی عرصہ بعد (۱۷۹ ہجری میں) آپ فقہ سے حدیث کی طرف آ گئے اور بغداد کے محدثین کے ہاں جانے لگے۔ حدیث اور روایتِ حدیث میں اس قدر ڈوب گئے کہ اسی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ حدیث کا جتنا ذخیرہ بغداد میں موجود تھا آپ نے حتی الوسع اسے قلم بند کیا اور ۱۸۶ ہجری میں طلبِ حدیث کی خاطر بصرہ کی طرف پہلا سفر کیا۔

طلبِ حدیث میں آپ نے گلی گلی، کوچہ کوچہ، قریہ قریہ اور بستی بستی پیدل سفر کیا۔ پانچ دفعہ بصرہ گئے اور پانچ دفعہ حجازِ مقدس۔ اس کے علاوہ یمن، کوفہ اور مصر نے بھی اس طالبِ حدیث کی قدم بوسی کی۔ رے کا ارادہ تھا کہ تنگ دستی آڑے آ گئی اور زادِ سفر میسر نہ آ سکنے کی وجہ سے عازمِ منزل نہ ہو سکے۔ ایک مقام پر مہینوں قیام کرتے اور جب تک علم کی پیاس بجھ نہ جاتی، واپس نہ آتے۔ اکثر ایسا ہوا کہ سامانِ سفر ختم ہو جاتا، ایسے موقعوں پر آپ کے دوست معقول رقم کی پیش کش کرتے، لیکن آپ انکار کر دیتے۔ محنت مزدوری سے رزقِ حلال کما کر اپنے وطن لوٹتے۔

اس سفر و سیاحت میں آپ نے بہت سے شیوخ سے کسبِ فیض کیا۔ ان سب کے بارے میں معلومات حاصل ہونا یقیناً ناممکن ہے۔ تاہم فنِ حدیث و فقہ میں آپ کے اساتذہ کی تعداد ایک سو سے زائد بتائی جاتی ہے۔ آپ سب سے پہلے امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے حلقۂ درس سے وابستہ ہوئے لیکن یہ سلسلہ جلد ہی ختم ہو گیا اور



www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

حدیث سے تعلق قائم کر لیا۔

امام احمد رحمہ اللہ کی شخصیت پر سب سے زیادہ اثرات حافظ ہشیم بن بشیر بن ابی حازم (۱۰۴ ہجری تا ۱۸۳ ہجری) کے تھے۔ سولہ برس کی عمر میں وہ حافظ ہشیم کی شاگردی میں آئے اور ان کی وفات تک زیرِ تربیت رہے۔ حافظ ہشیم کے بعد امام صاحب نے سفرِ حجاز کے دوران میں امام شافعی کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا اور ایک طویل عرصہ ان کی خدمت میں رہے۔ حافظ ہشیم سے امام صاحب نے محدثانہ ذوق حاصل کیا اور امام شافعی سے فقیہانہ طرزِ فکر پایا۔

امام صاحب کے دو اہم اساتذہ سفیان ثوری اور عبد اللہ بن مبارک رحمہما اللہ ہیں۔ ان کے علاوہ آپ نے سفیان بن عیینہ، ابو بکر بن عیاش، وکیع بن الجراح، عبد الرحمٰن بن محمد یحییٰ بن سعید القطان اور دوسرے بہت سے اکابر ائمہ سلف سے علم حاصل کیا۔ یہ سب لوگ اپنے علم و فضل اور زہد و تقویٰ میں اپنی مثال آپ تھے۔

آپ کا علم و حلم، دور دراز کے سفر، عبادت و ریاضت اور کتابتِ حدیث کا جب ڈنکا بجنے لگا تو لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد نے آپ سے احکام و مسائل پوچھنے شروع کر دیے۔ آپ کے حزم و احتیاط کا یہ عالم تھا کہ آپ حتی الامکان عوام سے دور رہتے، لیکن آخر کب تک؟ اتباعِ سنت میں عمر کے چالیس سال مکمل ہونے کے بعد جامع مسجد بغداد میں درس و املا کا آغاز کیا۔ ہزاروں کی تعداد میں طالب علم اس مجلس میں شریک رہتے اور سیکڑوں طالب علم سپردِ قلم کرنے کا فریضہ بھی سرانجام دیتے تھے۔

امام احمد رحمہ اللہ کے درس کی دو مجالس ہوتی تھیں۔ ایک گھر ہی پر منعقد ہوتی جس میں آپ کے قریبی اور خاص شاگرد اور صاحب زادے شریک ہوتے۔ مسندِ احمد کی املا زیادہ تر یہیں ہوئی۔ یہ مجلس محدود اور مخصوص تھی۔ دوسری مجلس جامع مسجد کے صحن میں بعد نماز عصر منعقد ہوتی جس میں عام افراد شریک ہوتے۔ آپ کے درس کی چند قابلِ ذکر خصوصیات یہ ہیں:

ا۔ درس و افتا کی مجالس میں خاص طور پر اور امام صاحب کی نجی مجالس میں عام طور پر سنجیدگی، وقار اور متانت کا غلبہ رہتا۔

ب۔ درس سے قبل خوب خوب مطالعہ کرتے اور اکثر اوقات کتب بھی ہمراہ لاتے۔ اپنے شاگردوں کو بھی صرف حافظے کی بنا پر درس دینے سے منع کرتے تاکہ نقل و بیان میں فرق نہ ہو۔

ج۔ آپ احادیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی املا کراتے اور آپ کے شاگردِ رشید اسے لکھتے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

د۔ آپ اپنے فتاویٰ نقل کرنے سے منع کرتے۔

ہ۔ امام صاحب رحمہ اللہ کے ہاں قرآن و سنت کے بعد صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے اقوال کی بہت اہمیت تھی۔

و۔ آپ خیالی مسائل اور بے مقصد امور سے احتراز فرماتے۔

امام صاحب سے یقیناً ہزاروں لوگوں نے کسبِ فیض کیا لیکن آپ کے چند شاگردوں ہی نے نام کمایا۔ ان کے نام یہ ہیں:

ا۔ ابو عبداللہ محمد بن اسماعیل بخاری (۱۹۴ ہجری تا ۲۵۶ ہجری) مولف صحیح بخاری۔

ب۔ مسلم بن حجاج نیشاپوری (۲۰۲ ہجری تا ۲۶۱ ہجری) مولف صحیح مسلم۔

ج۔ صالح بن احمد بن حنبل (متوفی ۲۶۶ ہجری) یہ امام صاحب کے بیٹے تھے کثیر العیالی اور قرض کی وجہ سے طرطوس کے قاضی کا منصب قبول کیا۔ فقیہ تھے اور بحیثیتِ قاضی سب سے پہلے فقۂ حنبلی کا نفاذ کیا۔

د۔ ابو بکر احمد بن احمد (متوفی ۲۷۳ ہجری) محدث تھے۔

ہ۔ عبدالملک بن عبدالحمید المیمونی (متوفی ۲۷۴ ہجری)۔ امام صاحب کے اقوال کی جمع و نقل کا وسیع پیمانے پر اہتمام کیا۔

و۔ احمد بن محمد المھرزوری (متوفی ۲۷۵ ہجری)۔ ان کا میدانِ خاص فقہ تھا۔

ز۔ ابوداؤد سلیمان بن اشعث (۲۰۲ ہجری تا ۲۷۵ ہجری)۔ مولف سنن ابوداؤد۔

ح۔ عبداللہ بن احمد بن حنبل (۲۱۳ ہجری تا ۲۹۰ ہجری)۔ یہ امام صاحب کے بیٹے تھے اور ان کا میدانِ خاص روایتِ حدیث تھا۔ مسندِ احمد انھی کی کاوش و اضافہ کا نتیجہ ہے۔

ت۔ ابو بکر الخلال (متوفی ۳۱۱ ہجری)۔ بہت سی کتب کے مصنف ہیں۔ فقۂ حنبلی کی تدوین و اشاعت دراصل الخلال ہی کا کارنامہ ہے۔ ان کے شاگرد غلام الخلال کے نام سے مشہور ہیں جن کی فقۂ حنبلی میں وہی حیثیت ہے جو فقۂ حنفی میں امام ابو یوسف، امام محمد اور امام زفر کی ہے۔

۱۸۔ امام صاحب کی زندگی غربت و افلاس، فقر و فاقہ اور افلاس سے عبارت تھی۔ آپ نے کبھی فراغت اور بے فکری نہ دیکھی۔ موروثی جائداد سے کل سترہ درہم ماہانہ کرایہ آتا تھا جس میں بمشکل گزارہ ہوتا۔ مزدوری، بار برداری اور اجرت پر لکھنے پڑھنے کا کام بھی کرتے اور اشد ضرورت پر قرض بھی لے لیتے تھے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

خیر خواہوں نے بہت موقعوں پر مالی معاونت کی کوشش کی، لیکن آپ نے ہمیشہ انکار کر دیا۔ ایک مرتبہ کھانے میں کچھ نہ تھا آپ نے اپنا جوتا رہن رکھ کر روٹیاں خریدیں۔ کرایہ داروں کا کرایہ اکثر معاف کر دیتے۔ کپڑا بننے کا فن جانتے تھے اور بوقتِ ضرورت سوت سے کپڑا بن کر رزقِ حلال حاصل کرتے۔

غربت و افلاس اور علمی مشاغل کے باوجود دن اور رات میں تین سو نوافل پڑھتے، رات کے نوافل میں قرآنِ مجید کی کثرت سے تلاوت کرتے اور پھر سات دن میں ایک قرآنِ مجید ختم کر لیتے۔ حقوق العباد کا بہت خیال تھا چنانچہ ہر مریض کی عیادت کا اہتمام کرتے۔ آپ کے پاس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک بال مبارک تھا۔ آپ اکثر اس کو بوسہ دیتے اور آنکھوں سے لگاتے۔

امام صاحب کی طبیعت میں زہد و تقویٰ اور حبِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی عالم تھا جس نے فتنہ خلقِ قرآن میں آپ کو ثابت قدم رکھا۔ یہ فتنہ اس وقت پیدا ہوا جب عباسی خلیفہ مامون الرشید نے معتزلہ کے کہنے پر قرآنِ مجید کو مخلوق قرار دیا اور اس فلسفہ کو عقیدہ بنا کر بزور نافذ کرنا چاہا۔ امام صاحب نے اس خود ساختہ عقیدہ کی مخالفت کی اور قرآن کو خالق کا کلام قرار دیا۔ آپ پا بجولاں دربارِ خلافت میں لائے جا رہے تھے کہ مامون الرشید راہیِ ملکِ عدم ہوا خلیفہ معتصم باللہ نے آپ پر قہر و جبر کی انتہا کر دی۔ ایک جلاد تھک جاتا تھا تو دوسرا کوڑے برسانا شروع کر دیتا، کوڑوں میں اس قدر شدت ہوتی کہ ہاتھی پر پڑیں تو وہ بھی بلکنے لگے، لیکن امام صاحب کی قوتِ ایمانی نے یہ ظلم صبر و استقامت کے ساتھ برداشت کیا۔ اگر بے ہوش ہو جاتے تو تلوار کی نوک چبھا کر ہوش میں لایا جاتا۔ یہ مشقِ ستم ڈیڑھ سال تک روزانہ جاری رہی۔

استبداد مایوس ہوا تو آپ کو اس حال میں گھر بھیجا گیا کہ جسم لہولہان، زخموں سے چور اور مسلسل مار پیٹ اور جیل کی سختیوں کی وجہ سے آپ صاحبِ فراش تھے۔ حصولِ صحت کے بعد درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا تو خلیفہ واثق باللہ عباسی نے درس پر پابندی لگا دی حتیٰ کہ آپ کو نماز کے لیے بھی گھر سے نکلنے نہ دیا جاتا۔ واثق باللہ کے انتقال سے امام صاحب کی تکلیف اور آزمایش کا سلسلہ جو تقریباً پانچ سال جاری رہا، بالآخر ختم ہوا۔

''المسند'' آپ کی تصنیفات میں سے مقبول عام ہوئی۔ احادیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ مجموعہ مسند کہلاتا ہے جس میں ہر صحابی کی روایت کردہ احادیث اس کے نام سے ایک جگہ درج کر دی گئی ہوں۔ امام صاحب نے سولہ سال کی عمر (۱۸۰ ہجری) میں اس تالیف کا آغاز کیا اور رحلت تک اس میں مشغول رہے۔ آخری عمر میں آپ نے اہلِ خانہ کو اس کتاب میں درج تمام احادیث سنائیں۔ مسودہ ابھی بے ربط اوراق کی صورت میں موجود

تھا کہ پیغامِ اجل آن پہنچا۔ آپ کے بیٹے عبد اللہ نے اس مسودہ کو ترتیب و اضافہ کے ساتھ مدون کیا۔

''المسند'' کے اٹھارہ حصے ہیں، امام صاحب نے سات لاکھ پچاس ہزار احادیث میں سے صرف تیس ہزار کا انتخاب کیا، امام عبد اللہ بن احمد بن حنبل نے ان پر دس ہزار احادیث کا مزید اضافہ کیا۔ اس طرح اس تالیف میں کل چالیس ہزار[1] احادیث ہیں۔ اس کا شمار احادیث کی اہم کتب میں ہوتا ہے ''المسند'' کی چند خصوصیات یہ ہیں:

ا۔ پہلے عشرہ مبشرہ کی مرویات ہیں پھر ان کے قریب کے صحابہ کی۔

ب۔ تابعی کی روایت جس میں صحابی کا نام نہ لیا گیا ہو تابعی کے نام سے درج ہیں۔

ج۔ صرف ثقہ راوی کی حدیث قبول کی گئی۔

د۔ کسی حد تک کمزور حافظے کے مالک متقی لوگوں کی روایت قبول کر لی گئی۔

ہ۔ راوی کی ثقاہت کی تردید ہونے پر قبول کی گئی حدیث مسودہ سے خارج کر دی گئی۔

و۔ صحیح حدیث سے ٹکرا جانے والی حدیث قبول نہیں کی گئی۔

ز۔ سند و متن پر نقد و جرح کا اہتمام کیا گیا ہے تاہم متن پر بہت کم۔

ح۔ ضعفِ سند یا علتِ متن کی بنیاد پر روایت ترک نہ کی جاتی جب تک اس کی حدیثِ صحیح سے مخالفت ثابت نہ ہو جاتی۔

ت۔ منفرد راوی کی حدیث قبول نہ کی گئی، الّا یہ کہ علماے حدیث اس کی توثیق کر دیں۔

ی۔ صرف فقہی قاعدے کی مخالفت پر حدیث رد نہ کی جاتی۔

علما کے نزدیک ''المسند'' میں صحیح، حسن اور غریب قسم کی احادیث درج ہیں جبکہ بعض کے نزدیک موضوع احادیث بھی اس کتاب میں موجود ہیں۔ ''المسند'' کے علاوہ امام صاحب سے اور بھی متعدد تصنیفات منسوب ہیں، جن میں سے کچھ یہ ہیں:

ا۔ التاریخ
ب۔ الناسخ والمنسوخ
ج۔ المقدم والموخر فی کتاب اللہ
د۔ فضائلِ صحابہ
ہ۔ المناسک الکبیر
و۔ المناسک الصغیر
ز۔ کتاب الزہد
ح۔ الرد علی الجہمیہ
ی۔ کتاب الرد علی الزنادقہ

قرآنِ مجید کی ایک تفسیر بھی آپ سے منسوب کی جاتی ہے۔

---

ا۔ واضح رہے کہ متداول ''مسند'' میں ۲۷ ہزار احادیث ملتی ہیں۔ (ادارہ)

امام صاحب کی محدثانہ حیثیت اس قدر مسلمہ ہے کہ بعض علما آپ کو صرف محدث ہی مانتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ امام صاحب مجتہد مطلق فقیہ بھی تھے۔ اگرچہ فقہ یا اصولِ فقہ پر آپ کی کوئی با قاعدہ تصنیف موجود نہیں اور آپ نے اپنے فتاویٰ کی نقل سے بھی منع کیا تاہم امت کا ایک بڑا حصہ آپ کے زمانے سے آپ کی فقیہانہ دانش کا پیرو کار رہا ہے امام صاحب کے فقہی اصولوں کی بنیاد پر آپ کے شاگردوں نے پوری ایک فقہ مرتب کی جو آج تک فقۂ حنبلی کے نام سے موجود ہے۔ امام صاحب کے فقہی اصولوں میں سے چند یہ ہیں:

۱۔ دین کے معاملات میں بدعت کو سخت ناپسند فرماتے۔

۲۔ فتویٰ دے دینے کے بعد قوی تر دلیل کی بنیاد پر رجوع کر لیتے۔

۳۔ بعض اوقات کسی مسئلہ کے دو حل بھی بتادیتے اور کسی کو ترجیح نہ دیتے۔

۴۔ حدیثِ ضعیف پر صحابی کے فتوے کو ترجیح دیتے۔

۵۔ صحابی کے فتویٰ کی موجودگی میں اجتہاد نہ کرتے۔

۶۔ صحابہ کے اختلاف میں سکوت فرماتے یا قرآن وسنت سے قریب تر رائے کو اختیار کرتے۔

۷۔ صحابہ کے اختلاف میں بلند پایہ صحابہ کی رائے کو فوقیت دیتے۔

۸۔ کسی تابعی کا فتویٰ اگر قرآن وسنت کے قریب ہوتا تو قبول کر لیتے۔

۹۔ اجماع کو محال خیال کرتے اور اجماعی فتاویٰ کی قبولیت میں تردد پیش کرتے تاہم اکثر علمی معاملات میں اجماع کی مطلق نفی نہ کرتے۔

۱۰۔ اجماعِ صحابہ کو حجت مانتے۔ اگر کوئی حدیث اجماعِ صحابہ سے ٹکرا جاتی تو اس حدیث کو شاذ گردانتے۔

۱۱۔ عہدِ تابعین کے مشہور قول کو حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے کم اور قیاس سے بہتر سمجھتے۔

۱۲۔ قیاس سے حتی الامکان دور رہتے۔

۱۳۔ قیاس پر حدیثِ ضعیف کو ترجیح دیتے۔

۱۴۔ استصحاب کے قائل تھے۔ استصحاب یہ ہے کہ جس بات پر ماضی سے عمل ہوتا چلا آ رہا ہو وہ حال و مستقبل میں بھی جاری رہے گی، بشرطیکہ اس کے خلاف کوئی واضح نہ حکم ہو۔

۱۵۔ مصالح مرسلہ کو فقہی اصول قرار دیتے تھے جس کا مفہوم یہ ہے کہ عوام الناس کو بے جا تکلیف سے بچایا جائے۔

۱۶۔ ذرائع کے قائل تھے۔ یعنی شارع نے جس کام کے کرنے کا حکم دیا ہے اس کی تکمیل کے لیے سارے

راستے کھول دیے، ان پر چلنا ضروری ہے اور جس کام سے منع کیا اس کے تمام راستے بند کر دیے چنانچہ ان پر چلنا ممنوع ہے۔

۱۷۔ مسئلے کی صورت جو پہلے سے چلی آ رہی ہو اسے اس وقت تک نہ چھیڑتے جب تک حالات تبدیلی کا تقاضا نہ کریں۔

۱۸۔ نصوص و آثار کی غیر موجودگی میں عرف و عادت پر فتویٰ دیتے۔

امام صاحب کے ان اصولوں کی بنا پر فقۂ حنبلی میں ان ماخذوں کو بالترتیب تسلیم کیا گیا ہے:

ا۔ نصوص (قرآن و سنت)

ب۔ فتاویٰ صحابہ (کتاب و سنت کے بعد صحابہ کا اجماع)

ج۔ اختلافِ صحابہ (کسی رائے کی فوقیت یا سکوت)

د۔ مرسل اور ضعیف روایت (مرسل اور صغیف روایت کی رائے پر فوقیت۔

ح۔ قیاس

و۔ استصحاب

ز۔ مصالح مرسلہ

ح۔ ذرائع

امت میں فقۂ حنبلی کو قبولِ عام حاصل ہوا۔ چنانچہ مشاہیر میں سے علامہ ابن العربی (مولف احکام القرآن)، شیخ الاسلام ابنِ تیمیہ، علامہ ابنِ جوزی، شیخ محمد بن عبد الوہاب، علامہ ابن رجب، ابنِ قدامہ اور شیخ عبد القادر جیلانی جیسے لوگ فقۂ جنبلی کے پیرو کار تھے۔ ''المسند'' کی متعدد شروح لکھی گئیں۔ حال ہی میں ڈاکٹر مصطفیٰ الاعظمی نے ''المسند'' کو کمپیوٹر میں محفوظ کیا ہے۔ خدا کرے امتِ مسلمہ کی کوکھ سرسبز و شاداب رہے اور اسلاف جیسے اخلاف جنم لیتے رہیں۔ (آمین)

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

محمد رفیع مفتی

# انسانی عظمت و کردار کا پیکر

انسانوں کے بارے میں تاریخ بڑی مردم شناس ہے۔ یہ اپنے دامن میں کبھی خزف ریزوں کو نہیں سمیٹتی، اسے صرف موتیوں ہی سے غرض ہوتی ہے۔ خزف ریزوں کو یہ ماضی کے اس اندھیرے سمندر میں پھینک دیتی ہے، جس کے اندر اترنے والی ہر شے معدوم ہو جاتی ہے۔

ہماری تاریخ نے اپنے دامن میں جن موتیوں کو سمیٹا ہے، ان میں امام احمد بن حنبل کا نام ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔ انسانی عظمت و کردار کا یہ پیکر اس امت کی یادداشت میں ایک ناقابل فراموش ہستی ہے۔

امام احمد رحمہ اللہ کی زندگی کے جس گوشے کو بھی دیکھیے، بہت حیرت ہوتی ہے۔ ان کی زندگی میں رونما ہونے والے بڑے بڑے واقعات، ان کے کردار کی عظمت اور بلندی کی داستان سناتے اور چھوٹے چھوٹے واقعات، ان کی مروت اور تواضع کی کتھا بیان کرتے ہیں۔ لیکن شاید یہ کہنا صحیح ہے کہ بڑے لوگوں کی زندگی میں آنے والا کوئی واقعہ بھی چھوٹا نہیں ہوتا۔ بارش کا جو قطرہ بھی دریا میں گرتا ہے، دریا ہو جاتا ہے۔

یہ واقعہ امام احمد پر فتنۂ خلق قرآن کے سلسلے میں آنے والی کڑی آزمایش سے بعد کا ہے۔ ابوحاتم محمد بن حبان کہتے ہیں: بغداد میں ہمارا ایک پڑوسی ہوا کرتا تھا، ہم اسے ''طبيب القراء'' یعنی علما کا معالج کہتے تھے۔ وہ علما کے علاج معالجے کے حوالے سے ہر وقت ان کی خدمت میں لگا رہتا۔ کبھی ایک عالم کے پاس جاتا، کبھی دوسرے کے پاس، ان کی خیریت دریافت کرتا اور ان کی ضروریات پوری کرنے کا اہتمام کرتا۔ علم کا یہ خادم امام احمد کے پاس آیا تو میں نے دیکھا کہ آپ شدید کرب میں مبتلا ہیں۔ پوچھا: خیریت تو ہے۔ کہنے لگے: ہاں،

خیریت ہی ہے۔ میں نے کہا: خیریت کے باوجود یہ کرب، رنج و غم۔ کہنے لگے: تم جانتے ہی ہو مجھ پر یہ آزمایش جو آئی تھی۔ ان لوگوں نے مجھے کوڑے مارے، میں زخمی ہو گیا، پھر انھوں نے میرا علاج کیا۔ میرے سارے زخم تو صحیح ہو گئے، لیکن کمر میں ایک جگہ مجھے شدید درد ہوتا ہے۔ میں نے کہا: آپ ذرا مجھے کمر تو دکھایئے۔ انھوں نے کمر سے کپڑا اہٹایا۔ میں نے دیکھا، اس پر صرف مار کے نشان تھے، کوئی زخم وغیرہ نہ تھا۔ میں نے کہا: مجھے اس درد کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہو رہی، لیکن خیر میں اس کے بارے میں معلوم کروں گا۔ پھر میں ان کے ہاں سے نکلا اور سیدھا اس جیل گیا، جہاں امام احمد کو قید رکھا گیا تھا۔ اس جیل کے نگران کے ساتھ میرے اچھے روابط تھے۔ میں نے اس سے کہا: میں اپنی ایک ضرورت کے لیے جیل کے اندر جانا چاہتا ہوں۔ اس نے کہا چلے جاؤ۔ میں جیل میں داخل ہوا۔ وہاں کے سب قیدیوں کو جمع کر لیا، ان میں کچھ درہم تقسیم کیے اور ان سے بات چیت کرنے لگا۔ آہستہ آہستہ جب وہ مجھ سے مانوس ہو گئے تو میں نے ان سے پوچھا: تم میں سے مار کھانے کے معاملے میں سب سے بہادر کون ہے؟ پہلے تو وہ آپس میں بحث کرنے لگے، لیکن پھر سب ایک قیدی کے بارے میں متفق ہو گئے کہ ہم میں سے مار کھانے میں وہ سب سے آگے ہے۔ میں نے اس سے کہا: مجھے تم سے ایک بات پوچھنی ہے۔ اس نے کہا: پوچھیے۔ میں نے کہا: ایک بوڑھا آدمی ہے، جس کے کام تمھارے کاموں جیسے نہیں۔ اسے بھوک کی حالت میں شدید کوڑے مارے گئے۔ وہ شخص مرا تو نہیں، لیکن شدید زخمی ہو گیا۔ اس کے بعد انھوں نے اس کا علاج کیا اور وہ شفایاب ہو گیا۔ اب معاملہ یہ ہے کہ اس کی کمر میں ایک جگہ پر شدید درد ہوتا ہے، جسے وہ برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ میری بات سن کر ہنس دیا۔ میں نے پوچھا: کیا بات ہے؟ کہنے لگا: جس نے اس کا علاج کیا تھا، وہ معالج نہیں کوئی جولاہا تھا۔ میں نے کہا: کیا مطلب؟ اس نے کہا: اس نے اس کی کمر میں مردہ گوشت کا ایک ٹکڑا چھوڑ دیا ہے۔ میں نے پوچھا: اب کیا کرنا چاہیے؟ کہنے لگا: کسی جراح کو اس کی کمر سے وہ ٹکڑا نکال کر پھینک دینا چاہیے۔ ورنہ اس کا اثر اس کے دل تک جا پہنچے گا اور اسے ہلاک کر دے گا۔ وہ معالج کہتا ہے: میں جیل سے نکلا اور امام احمد کے پاس واپس آیا۔ وہ اسی تکلیف میں مبتلا تھے۔ میں نے انھیں ساری بات بتائی۔ انھوں نے کہا: جراحی کون کرے گا: میں نے کہا: میں کروں گا۔ انھوں نے پوچھا: تم جراحی کر لوگے؟ میں نے کہا: ہاں۔ چنانچہ امام احمد اٹھے، گھر میں داخل ہوئے اور تھوڑی دیر کے بعد باہر آئے۔ ان کے ہاتھ میں دو تکیے اور کاندھے پر ایک تولیہ تھا۔ ایک تکیہ مجھے دیا اور ایک اپنے لیے رکھا۔ کہنے لگے: اللہ سے خیر کی دعا کرو۔ میں نے ان کی کمر سے کپڑا اہٹایا اور کہا: مجھے درد کی جگہ بتائیں: انھوں نے کہا: کمر پر اپنی انگلی رکھو تو میں

تمھیں بتاؤں گا۔ میں نے اپنی انگلی رکھی، پوچھا: یہاں درد ہے؟ کہنے لگے: یہاں اللہ کی عافیت ہے اور میں اس پر اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں۔ میں نے انگلی تھوڑی سی آگے رکھی، پوچھا: یہاں درد ہے؟ کہنے لگے: یہاں بھی اللہ کی عافیت ہے اور میں اس پر اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں۔ میں نے انگلی تھوڑی سی اور آگے رکھی، پوچھا: یہاں درد ہے؟ کہنے لگے: یہاں میں اللہ سے اس کی عافیت چاہتا ہوں۔ میں سمجھ گیا کہ درد یہیں پر ہے۔ چنانچہ میں نے اپنا نشتر اس جگہ پر رکھا۔ جو نہی انھوں نے اپنی کمر پر نشتر کو محسوس کیا، اپنا ہاتھ اپنے سر پر رکھ دیا اور کہنے لگے، اے اللہ، معتصم کی مغفرت کر دے۔ اے اللہ، معتصم کی مغفرت کر دے۔ وہ مسلسل یہی دعا کرتے رہے، یہاں تک کہ میں نے مردہ گوشت کا ٹکڑا نکال کر باہر پھینک دیا، زخم پر پٹی باندھ دی۔ پھر انھیں سکون آ گیا۔ کہنے لگے: میں گویا کسی شے سے لٹکا ہوا تھا اور اب اتار دیا گیا ہوں۔ میں نے کہا: اے ابو عبداللہ (امام احمد)، لوگوں کو جب کوئی تکلیف دی جاتی ہے تو وہ اپنے اوپر ظلم کرنے والے کے خلاف بددعا کرتے ہیں۔ میں نے آپ کو اس حالت میں معتصم کے لیے دعائیں کرتے دیکھا ہے۔ کہنے لگے: میں نے یہ بات سوچی تھی، جو تم کہہ رہے ہو۔ لیکن وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا رضی اللہ عنہ کی اولاد ہے، چنانچہ مجھے یہ بات پسند نہیں آئی کہ میں قیامت کے دن اس طرح اٹھوں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی رشتہ دار کے ساتھ میری کوئی دشمنی ہو۔ میں نے معتصم کو معاف کر دیا ہے، وہ میری طرف سے آزاد ہے۔

یہ ہے امام امت۔ کیسا ظرف، کیسی عظمت اور کیسی وفا۔ خدا سے یہ تعلق کہ رُویں رُویں پر اس کی عافیت کا احساس اور نبی سے یہ تعلق کہ اپنے اوپر انتہائی ظلم کرنے والے کے لیے بھی دعاے مغفرت۔ امت اخلاص و وفا کے اس پیکر کو اپنی یادداشت سے کیسے فراموش کر سکتی ہے۔

اے اللہ امام احمد کی مغفرت فرما۔ اے اللہ، امام احمد کے درجات کو بلند فرما۔ آمین ثم آمین۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

طالب محسن

''اشراق'' کے نام خطوط میں پوچھے گئے

سوالات پر مبنی مختصر جوابات کا سلسلہ

# لفظ ''کافر'' کا لغوی استعمال

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

**سوال:** کیا قرآنِ مجید میں کسی جگہ لفظ 'کافر' اپنے لغوی معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے؟

(محمد صفتین، راولپنڈی)

**جواب:** کافر کے معنی ہیں: انکار کرنے والا۔ قرآن میں یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ بالعموم اس کا مفعول نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا انکار ہے۔ بعض آیات میں آخرت کے انکار کی تصریح ہے۔ وہ آیات بھی ہیں جن میں اس سے صرف قریش کے منکرین مراد ہیں، مثلاً دیکھیے سورۂ صف کی آیت ۸۔

## عصمتِ انبیا

**سوال:** ہمارے ہاں یہ خیال رائج ہے کہ انبیا معصوم ہوتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر انبیا سے کسی گناہ کا سرزد ہونا محال ہے تو پھر حضرت آدم اور حضرت یونس علیہما السلام کے افعال کی ہم کیا توجیہ کر سکتے ہیں؟ (محمد صفتین راولپنڈی)

**جواب:** انبیا کی عصمت کے معنی یہ ہیں کہ وہ نفس کے کسی داعیے کے تحت غلطی نہیں کرتے۔ البتہ بعض واقعات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان سے خدا تعالیٰ کی اطاعت کے جذبے کے تحت ہی حدود سے تجاوز ہوا۔ عام

آدمی اگراس طرح کا کوئی معاملہ کرے تو اس پر گرفت نہیں ہوتی۔ لیکن چونکہ انبیا کی اتباع بھی کی جاتی ہے چنانچہ ان پر گرفت کی گئی ہے۔ حضرت یونس علیہ السلام نے اپنی قوم کے مسلسل انکار پر دین کی غیرت میں اپنی قوم کو وقتِ موعود سے پہلے خیر باد کہا ہے۔ لہٰذا ان کے اس عمل کو درست قرار نہیں دیا گیا۔ بالکل واضح ہے کہ ان کے اس عمل کے پیچھے کوئی ذاتی مفاد یا خواہش، محرک کی حیثیت سے موجود نہیں۔ حضرت آدم کے واقعے میں خود خدا کی گواہی موجود ہے کہ وہ بھول گئے تھے۔ بھول جانے کی صورت میں ہونے والا عمل ظاہر ہے اپنی نوعیت ہی کے اعتبار سے مختلف ہے۔ اسے وہ عمل قرار نہیں دیا جا سکتا جو ذاتی مفاد یا خواہش کے محرک کے تحت کی گئی نافرمانی پر مبنی ہو۔

## دیگر انبیا کے پیرووں کو غیر مسلم کہنا

**سوال:** قرآن سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیا کو ایک ہی دین دے کر دنیا میں بھیجا اور حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت یوسف، حضرت عیسیٰ کے پیرووں کو مسلم کہا ہے۔ آج ان کو غیر مسلم کہا جاتا ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ (محمد صفتین راولپنڈی)

**جواب:** ہر نبی کی امت کے لیے لازم ہے کہ وہ دوسرے انبیا کی نبوت کا اقرار کرے۔ خدا کے اتارے ہوئے دین کو ماننے والی امتوں کے لیے لازم رہا ہے کہ وہ نئے آنے والے نبی پر ایمان لائیں اور اس کی اطاعت کریں۔ اگر وہ ایسا نہ کریں تو وہ مسلم کہلانے کے حق سے محروم ہو جاتی ہیں۔ پیغمبر آخر الزمان کی بعثت کے بعد اب وہ تمام لوگ غیر مسلم ہیں جو آپ پر ایمان نہیں لاتے۔

## سنت اور فرض

**سوال:** سنت کی آئینی حیثیت کیا ہے؟ فرض اور سنت میں کیا فرق ہے؟ ''اشراق'' نومبر ۱۹۹۹ء میں استاد جاوید احمد صاحب غامدی نے اپنے مضمون ''اصول و مبادی'' میں نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج اور قربانی کو سنن کا درجہ دیا ہے۔ جبکہ ہم سب جانتے ہیں کہ نماز، روزہ، زکوٰۃ، اور حج فرض ہیں۔ کیا سنت پر عمل کرنا بھی فرض کی طرح ضروری ہوتا ہے؟ (محمد صفتین راولپنڈی)

**جواب:** آپ نے جس مضمون کے حوالے سے یہ سوال کیا ہے اس میں سنت کا لفظ ہمارے ہاں رائج معنی

میں استعمال نہیں ہوا۔ استادِ گرامی کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی امت اپنا دین جاننے کے لیے دو ماخذوں سے رجوع کرتی ہے۔ ایک ماخذ قرآنِ مجید اور دوسرا ماخذ سنت ہے۔ یعنی دین کے کچھ مشمولات ہم اصلاً قرآن سے پاتے ہیں اور کچھ اصلاً سنت سے۔ یعنی یہ ممکن ہے کہ ایک عمل ہمیں اصل میں سنت سے ملا ہو لیکن اس کا تذکرہ قرآنِ مجید میں بھی ہو۔ مزید برآں یہ بات بھی واضح رہنی چاہیے کہ قرآنِ مجید کے احکام میں فرائض بھی ہیں اور نوافل و آداب بھی، اسی طرح سنت میں لازمی امور بھی ہیں اور نفلی بھی۔ آپ جاوید صاحب کے مضمون کو دوبارہ پڑھیں اور ان نکات کو پیشِ نظر رکھیں۔ امید ہے آپ مضمون کے اصل مدعا کو پالیں گے۔

## نسخ و منسوخ

**سوال:** کیا قرآنِ پاک میں بعض ایسی آیات بھی موجود ہیں جو منسوخ ہو چکی ہیں؟ اگر یہ بات درست ہے تو کیا یہ بات قرآنِ حکیم کو ساقط الاعتبار کر دینے کے لیے کافی نہیں؟ کیا کوئی ایسی دستوری دستاویز بھی دنیا میں کہیں موجود ہے جس میں ایسی بات ہے؟ منسوخ آیات کو بیان کرنے میں کیا حکمت پنہاں ہے؟ کیا کسی آیت میں تبدیلی بھی کی گئی ہے؟ جیسا کہ بخاری شریف میں موجود حدیث سے پتا چلتا ہے؟ (محمد صفتین راولپنڈی)

**جواب:** اس میں تو شبہ نہیں کہ قرآنِ مجید میں منسوخ آیات موجود ہیں۔ مثلاً روزہ کے احکام میں ناسخ و منسوخ آیات ساتھ ساتھ درج ہیں۔ ان سے قرآنِ مجید ہرگز ساقط الاعتبار نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ وہ آیات بھی موجود ہیں جن سے کوئی حکم منسوخ ہوا ہے۔ منسوخ آیات کو باقی رکھنے کی وجہ اس حکمت کو واضح کرنا ہے جو حکم کو تبدیل کرنے کا باعث بنی۔ اس سے ہم شریعت کے نفاذ میں تدریج کے اصول سے واقف ہوتے ہیں جو ایک ناگریز ضرورت ہے۔

## بائیبل میں تحریف

**سوال:** بائیبل کے متعلق ہمارے علما کی رائے یہ ہے کہ اس میں لفظی تحریف ہوئی ہے۔ میرا سوال یہ ہے کہ تحریف سے مراد لفظی تحریف ہے یا معنوی تحریف؟ قرآن نے بیسیوں مقامات پر اس تورات اور انجیل کی تصدیق کی ہے جو نزولِ قرآن کے وقت اہلِ کتاب کے پاس موجود تھیں۔ اگر تحریف

سے مراد لفظی تحریف ہے تو پھر ہمیں ان غلط صحائف پر ایمان لانے کا حکم کیوں دیا گیا؟ اہلِ کتاب کو تورات وانجیل پر عمل کرنے کی دعوت کیوں دی گئی؟ ان غلط صحائف کے حاملین کو 'امة مقتصدہ' اور 'یھدون الی الحق' کیوں کہا گیا؟

امام بیضاوی اپنی مشہور تصنیف میں فرماتے ہیں کہ تحریف سے مراد یہود کی غلط تفاسیر وتاویلات ہیں۔ کسی کتاب میں لفظی تحریف بہت مشکل ہے۔ ہر زمانے میں تورات کے بے شمار نسخے موجود تھے۔ اور ایسے لوگوں کی تعداد بھی کم نہیں تھی جنھیں اپنی کتاب سے انتہائی عشق تھا۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ کسی بدنیت نے تورات کے ذاتی نسخے میں تحریف کر دی اور اسے خواص وعوام یعنی تمام پیروانِ تورات نے تسلیم کر لیا۔ میری رائے میں نصاریٰ کی تثلیث، یہود کا ابنیتِ عزیر کا عقیدہ، زرتشتیوں کی آتش پرستی اور ہندوؤں کا فلسفۂ حلول تحریفِ معنوی کا نتیجہ تھا۔ میری بات کی تصدیق سورۂ بقرہ کی آیت ۷۵ سے ہوتی ہے۔

اگر اللہ ہمیں لفظی تحریف سے آگاہ کرنا چاہتا تو صاف فرماتا: ''وہ تورات کے الفاظ کو بدل کر سنایا کرتے تھے۔'' یہ پہلے سمجھنا اور پھر تحریف کرنا معنوی تحریف کے معنوں میں آتا ہے۔ دوسری طرف بائیبل میں بعض ایسے مفہوم کی حامل آیات سے بھی سابقہ پیش آتا ہے جو صریحاً کلامِ الٰہی نہیں ہو سکتیں۔ اس تضاد کو کیسے رفع کیا جائے براہِ کرم جواب وضاحت سے دیں؟ (محمد صفتین راولپنڈی)

**جواب:** آپ نے جس آیت کا حوالہ دیا ہے اس کے تحت مولانا امین احسن صاحب اصلاحی نے تحریف کی صورتوں کی توضیح کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''حرف الشئ عن وجھہ' کے معنی ہیں کسی شے کو اس کے صحیح رخ سے موڑ کر دوسری سمت میں کر دینا اسی سے ' حرف القول' یا' حرف الکلام' ہے، جس کے معنی بات یا کلام کے بدل دینے کے ہیں۔ اس بدل دینے کی کئی شکلیں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً ایک بات کی دیدہ دانستہ ایسی تاویل کر دی جائے جو قائل کے منشا کے بالکل خلاف ہو۔ کسی لفظ کے طرزِ ادا اور قراءت میں ایسی تبدیلی کر دی جائے جو لفظ کو کچھ سے کچھ بنا دے۔ مثلاً مروہ کو بگاڑ کر مورہ یا مریا وغیرہ کر دیا گیا۔ کسی عبارت یا کلام میں ایسی کمی بیشی کر دی جائے جس سے اس کا اصل مدعا بالکل خبط ہو کر رہ جائے۔ مثلاً حضرت ابراہیم کے ہجرت کے واقعہ میں یہود نے اسی طرح کاردوبدل کیا کہ خانہ کعبہ سے ان کا کوئی تعلق ثابت نہ ہو سکے۔ کسی ذو معنی لفظ کا وہ ترجمہ کر دیا جائے جو سیاق و

سباق کے بالکل خلاف ہو مثلاً عبرانی کے ابن کا ترجمہ بیٹا کر دیا دراں حالیکہ اس کے معنی بندہ اور غلام کے بھی آتے ہیں۔ ایک بات کا مفہوم بالکل واضح ہو لیکن اس کے متعلق ایسے سوالات اٹھا دیے جائیں جو اس واضح بات کو مبہم بنا دینے والے یا اس کو بالکل مختلف سمت میں ڈال دینے والے ہوں۔ اہلِ کتاب تحریف کی ان تمام قسموں کے مرتکب ہوئے۔ اور قرآن نے ان کو ان سب کا مجرم گردانا ہے۔'' (تدبرِ قرآن ج ۱، ص ۲۵۲)

مولانا کی تصریحات سے واضح ہے اور خود یہود و نصاریٰ کے اپنے اعترافات سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ بائیبل میں بہت سی لفظی اور معنوی تحریفات ہوئی ہیں۔ یہ بات درست ہے کہ کسی کتاب میں لفظی تبدیلی آسان نہیں ہے۔ لیکن تورات کی تاریخ کافی مخدوش ہے۔ اصل کتاب صدیوں پہلے نایاب ہو جاتی ہے۔ لوگوں کے پاس مختلف تراجم ہیں اور ترجمہ کرنے والوں کے لیے ہر طرح کی تبدیلی کرنا ایک سہل کام ہے۔ مزید یہ کہ ترجمہ نگاروں کا کام رائج ہونے میں کوئی اصل کتاب رکاوٹ کے طور پر موجود نہیں رہی۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

محمد بلال

# ایک ''سعادت مند خادم'' کی رحلت

فروری ۱۹۲۳ء کی ۲تاریخ تھی۔ مولانا حکیم عبدالحئی بسترِ علالت پر دراز تھے۔ان کا نو دس برس کا بچہ ان کے پاؤں داب رہا تھا۔اس دوران میں اس بیمار کی آواز بند ہو گئی۔ قریب بیٹھی اس بچے کی بہنوں کو تشویش ہوئی۔ وہاں موجود بیمار کے ایک دوست نے جو حکیم ہی تھے، اس تشویش کو دکھ میں تبدیل کر دیا۔انھوں نے اس بات کی تصدیق کر دی کہ مولانا عبدالحئی وفات پا چکے ہیں۔ شہر میں فوراً یہ خبر پھیل گئی۔ مرحوم سے محبت اور عقیدت رکھنے والے جوق در جوق آنے لگے۔ان سب لوگوں کی ہمدردی اور دل جوئی کا مرکز و محور وہی نو دس سالہ بچہ تھا۔ کوئی اسے شفقت سے اپنے پاس بٹھالیتا، کوئی سینے سے لگالیتا، کوئی سر پر ہاتھ پھیرتا، سب کی آنکھیں اشک بار تھیں، لیکن وہ بچہ نہیں جانتا تھا کہ ان تعزیت کرنے والوں کی باتوں کا کیا جواب دینا ہے۔ اس بچے کا بڑا بھائی ان باتوں کا مناسب جواب دینے کی صلاحیت رکھتا تھا، مگر وہ اس سانحہ سے بالکل بے خبر اور بہت دور تھا۔

یہ بچہ کون تھا جو نو دس سال کی عمر ہی میں یتیم ہو گیا؟ یہ بچہ ابوالحسن علی تھا جس نے سید ابوالحسن علی ندوی کے نام سے عالم گیر شہرت حاصل کی اور ''علی میاں'' کے نام سے لوگوں کے دلوں میں جگہ پائی۔ علی میاں خود اپنے والد کی وفات سے اپنے بڑے بھائی جناب عبدالحئی کی بے خبری اور باخبر ہونے کے بارے میں لکھتے ہیں:

''بھائی صاحب جنھوں نے یہ خبر اتفاقیہ بمبئی میں والد صاحب کے ایک دوست سے سنی تھی، جب لکھنؤ واپس ہوئے اور رائے بریلی پہنچے تو سیدھے قبر پر گئے۔ میں بھی ساتھ ہو لیا۔ان کا قبر پر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونا اس وقت آنکھوں کے سامنے ہے اور کل کی بات معلوم ہوتی ہے۔بس اسی وقت سے ان کے اندر ہم سب

لوگوں نے ایک انقلاب محسوس کیا، اب وہ نرے بڑے بھائی نہ تھے جو اپنی تعلیم کی تکمیل میں ہمہ تن مشغول، یکسو اور گھر کے قصوں سے بے تعلق و فارغ تھے۔ اب وہ ہم چھوٹے بھائی بہنوں کے شفیق باپ اور والدہ صاحبہ کے ایک سعادت مند فرزند، بلکہ خادم تھے۔ میں نے ان سے صرف شفقتِ پدری کا اظہار ہوتے نہیں دیکھا بلکہ شفقتِ مادری کا بھی صاف صاف ظہور ہوتا تھا۔'' (کاروانِ زندگی، ص ۷۸-۷۹)

واقعی، زندگی ایسی ہی ہے۔ اس کی باتوں کو ایک طویل عرصہ گزر جائے تب بھی وہ ''کل کی بات معلوم ہوتی ہیں۔'' جو ''سادہ لوح'' لوگ زندگی کی بے ثباتی کو سمجھ نہیں پاتے، وہ خدا اور آخرت سے بے نیاز زندگی گزارتے ہیں اور جو ''دانا'' اس حقیقت کا شعور حاصل کر لیتے ہیں وہ خدا اور آخرت کے لیے زندگی گزارتے ہیں۔ علی میاں بھی ''دانا'' لوگوں میں سے تھے بلکہ وہ ''دانا'' لوگوں میں بھی غیر معمولی مقام پر فائز لوگوں میں سے تھے۔ علی میاں کے بڑے بھائی والد کی وفات کے بعد جس طرح ایک گھر کے ''سعادت مند خادم'' بن گئے اسی طرح علی میاں شعور کی آنکھ کھولنے کے بعد برصغیر پاک و ہند، اس کے بعد عرب کے بھی اور پھر عالمِ اسلام کے ''سعادت مند خادم'' بن گئے تھے اور آپ نے آخری سانس تک اس خدمت کا سلسلہ جاری رکھا۔

آہ! ۳۱ دسمبر ۱۹۹۹ء کو علی میاں وفات پا گئے۔ آپ پر فالج کا حملہ ہوا تھا جو جان لیوا ثابت ہوا۔

علی میاں کے بعض علمی اور سیاسی نظریات سے اختلاف ہو سکتا ہے، لیکن یہ بات کہ انھوں نے بڑے خلوص کے ساتھ دین کی بے پناہ خدمت کی، اس سے اختلاف کی رتی برابر بھی گنجایش نہیں ہے۔

علی میاں کا تعلق حسنی سادات کی ایک شاخ سادات قطبیہ سے تھا۔ آپ کے جد اعلیٰ کبیر الشیخ قطب الدین المدنی (وفات ۶۷۷ ہجری) ساتویں صدی ہجری کے نصف اول میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ بغداد سے غزنی (ہندوستان) تشریف لائے۔ بغداد میں اس وقت تاتاریوں نے حملہ کر دیا تھا اور اپنی روایتی لوٹ مار کا بازار بھی گرم کر رکھا تھا۔

یہاں اس وقت خاندانِ غلاماں کی ترک اسلامی حکومت قائم تھی۔ اپنے خاص خاندانی پس منظر کے باعث شیخ قطب الدین یہاں ''شیخ الاسلامی'' کے عہدے پر فائز ہوئے۔ آپ نے جنگ میں بھی حصہ لیا۔ آپ کی قیادت میں ضلع الہ آباد میں کرناٹک پور کا علاقہ فتح ہوا جو سلطانِ دہلی نے آپ کو بطور جاگیر عطا کیا۔ آپ کی قبر آج بھی وہاں موجود ہے۔

اسی خاندان میں پھر زاہد اور درویش شخصیت الشیخ علم اللہ پیدا ہوئی۔ اس خاندان میں الشیخ علم اللہ کے تقریباً ایک سو سال بعد سید احمد شہید رائے بریلوی جیسی ہستی پیدا ہوئی۔

اس خاندان میں علم و فضل کا سلسلہ جاری رہا۔ علی میاں کے دادا سید فخر الدین خیالی شاعر اور مصنف تھے۔ علی میاں کے والد گرامی مولانا حکیم عبد الحئ مؤرخ اور ادیب تھے۔ مولانا حکیم عبد الحئ مولانا سید شبلی نعمانی کے رفقا میں سے تھے اور ندوۃ العلما کے تاحیات ناظم رہے۔ علی میاں نے بھی اس درس گاہ سے تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۶۱ء میں والد کی وفات کے بعد علی میاں ندوۃ العلما (جس کو اختصار کے ساتھ ''ندوہ'' بھی کہا جاتا ہے) کے ناظم مقرر ہوئے اور آخر تک یہ ذمہ داری پوری کرتے رہے۔ یہاں ضروری محسوس ہوتا ہے کہ ''ندوۃ'' کے بارے میں کچھ وضاحت کر دی جائے۔

برصغیر میں دارالعلوم دیوبند کا مقصد لوگوں کو دینی تعلیم اور علی گڑھ کالج کا مطمح نظر دنیوی تعلیم سے آراستہ کرنا تھا، مگر اس سے دینی اور دنیوی تعلیم میں ایک خلیج حائل ہونا شروع ہو گئی، اس وقت کے دلِ دردمند اور دیدۂ بینا رکھنے والے لوگوں کو احساس ہوا کہ ایک ایسی درس گاہ قائم ہونی چاہیے جہاں دینی اور دنیوی علوم کو یکجا کر دیا جائے۔ اس خواب کو صورت پذیر کرنے میں مولانا حکیم عبد الحئ اور مولانا شبلی نعمانی نے نمایاں کردار ادا کیا۔

۱۸۹۸ء میں اس دارالعلوم کی بنیاد رکھی گئی۔ ابتداً یہ ایک چھوٹا سا مدرسہ تھا جو آج ایک عظیم اسلامک عربیک یونیورسٹی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ''ندوہ'' نے جو ترقی علی میاں کے دورِ نظامت میں کی، وہ ترقی اور کسی دور میں نہ ہو سکی۔ ''ندوہ'' کیا تھا اور کیا بن گیا؟ اس کے بارے میں خود علی میاں لکھتے ہیں:

''ندوالعلما کی تحریکِ اصلاحِ نصاب اور دینی تعلیم کی ترقی اور اس کو عصرِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق بنانے (تطویر) کی مہم کوئی محدود مقامی اور وقتی تحریک نہ تھی، وہ ایک مستقل ''دبستانِ فکر'' تھا جو عقائدِ صحیحہ سے لے کر تعلیمی نظریہ، تاریخ کے خاص تصور، تہذیب و ثقافت، علم و ادب کے خاص معیار، سب کو اپنے وسیع دامن میں لیے ہوئے تھا۔ اکتوبر، نومبر ۱۹۷۵ء میں جب ندوۃ العلما کا وہ پچاسی سالہ تعلیمی جشن منعقد ہوا جو اپنی مقصدیت اور افادیت، مختلف طبقات کی نمائندگی اور عرب فضلا و اہلِ فکر کی اتنی بڑی تعداد کی شرکت کی وجہ سے (جو اس سے پہلے اس برصغیر میں دیکھنے میں نہیں آئی تھی) ایک یادگار اور تاریخی اجتماع تھا، اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ ندوۃ العلما کے مسلک کو موقر شرکاے اجلاس کے سامنے واضح اور آیندہ نسلوں کے لیے متعین کر دیا جائے تاکہ کسی قسم کا التباس باقی نہ رہے تو راقم سطور نے ندوۃ العلما کے محرکِ اول (مولانا سید محمد علی مونگیری رحمہ اللہ) اور ان کے روشن ضمیر رفقاے کار اور بانیانِ ندوۃ العلما کی تحریروں اور تقریروں، ان کے مسلک و خیالات اور ان کے مقاصد و دلی جذبات کو سامنے رکھ کر تحریکِ ندوۃ العلما کی فکری

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

بنیادوں، اس کے اعتقادی اور فکری حدود اربعہ اور اس کے نمایاں خط و خال کو اپنے الفاظ میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ اور اس تحریر کو دارالعلوم کے صدر دروازہ پر نمایاں طریقہ پر مرتسم کر دیا گیا جو ابھی تک باقی ہے۔'' (کاروانِ زندگی، ص ۱۴۰)

اس تحریر کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''دین و عقائد کے معاملہ میں ندوۃ العلما کے مسلک کے بنیاد دینِ خالص پر ہے جو ہر قسم کی آمیزش اور آلایش سے پاک، تاویل اور تحریف سے بلند، ملاوٹ اور فریب کی دسترس سے دور اور ہر اعتبار سے مکمل اور محفوظ ہے۔

دین کے فہم اور اس کی تشریح اور تعبیر میں اس کی بنیاد اسلام کے اولین اور صاف و شفاف سرچشموں سے استفادہ اور اس کی اصل کی طرف رجوع پر ہے۔

اعمال و اخلاق کے شعبہ میں دین کے جوہر و مغز کو اختیار کرنے، اس پر مضبوطی سے قائم رہنے، احکامِ شرعیہ پر عمل، حقیقتِ دین اور روحِ دین سے زیادہ قربت اور تقویٰ و صلاحِ باطن پر ہے۔

تصورِ تاریخ میں اس کی بنیاد اس پر ہے کہ اسلام کے ظہور اور عروج کا دورِ اول سب سے بہتر اور قابلِ احترام دور اور وہ نسل جس نے آغوشِ نبوت اور درس گاہِ رسالت میں تربیت پائی اور قرآن و ایمان کے مدرسہ سے تیار ہو کر نکلی، سب سے زیادہ مثالی اور قابلِ تقلید نسل ہے اور ہماری سعادت و نجات اور فلاح و کامرانی اس بات پر منحصر ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ اس سے استفادہ کریں اور اس کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کریں۔

نظریۂ علم و فلسفۂ تعلیم میں اس کی اساس اس پر ہے کہ علم بذاتِ خود ایک اکائی ہے جو قدیم و جدید اور مشرق و مغرب کے خانوں میں تقسیم نہیں کی جا سکتی اگر اس کی کوئی تقسیم ممکن ہے تو وہ تقسیم صحیح اور غلط، مفید اور مضر اور ذرائع اور مقاصد کے اعتبار سے ہو گی، استفادہ اور افادہ اور ترک و قبول کے شعبہ میں اس کا عمل اس حکیمانہ نبوی تعلیم پر ہے کہ ''حکمت مومن کا گمشدہ مال ہے، جہاں بھی وہ اس کو پائے وہ اس کا سب سے زیادہ مستحق ہے۔'' نیز قدیم حکیمانہ اصول 'خذ ما صفا ودع ما کدر' پر (یعنی جو صاف و نظیف ہو اس کو لے لو، اور جو آلودہ و کثیف ہو اس کو چھوڑ دو)۔'' (کاروانِ زندگی، ص ۱۴۱-۱۴۲)

علی میاں کا گھرانا غیر معمولی طور پر مذہبی اور علمی گھرانا تھا۔ یہاں تصنیف و تالیف کا بھی بہت رجحان تھا۔ علی میاں کی والدۂ محترمہ سیدہ خیر النساء حافظۂ قرآن، شاعرہ اور مصنفہ تھیں۔ اپنی اولاد کی تربیت کے معاملے میں آپ بہت حساس تھیں۔ آج کل کی مائیں بھی اپنے بچوں کے معاملے میں بہت حساس ہوتی ہیں، مگر ان کا بڑا مسئلہ



www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

یہ ہوتا ہے کہ ان کا بچہ روانی سے انگریزی بول سکے اور بہت اچھی تنخواہ، اختیارات اور مراعات کی حامل ملازمت حاصل کرنے کے قابل ہو سکے، مگر علی میاں کی والدہ آج کی ماں کی طرح ''سادہ لوح'' نہ تھیں۔ وہ ایک ''دانا'' خاتون تھیں۔ وہ انسان اور کائنات کی وجۂ تخلیق سے بہت اچھی طرح آگاہ تھیں۔ ان کے نزدیک اولاد کے معاملے میں بڑا مسئلہ کیا تھا؟ علی میاں کی زبانی سنیے:

''گھر میں کسی بڑے مرد کے نہ ہونے کی وجہ سے والدہ صاحبہ ہی میری نگرانی، اخلاقی و دینی تربیت کی ذمہ دار تھیں، مجھے قرآنِ مجید کی بڑی بڑی سورتیں انھوں نے اسی زمانہ میں یاد کرائیں، باوجود اس کے کہ ان کی شفقت خاندان میں ضرب المثل تھی اور والد صاحب کے انتقال کی وجہ سے وہ میری دل داری اور ایک حد تک ناز برداری قدرتاً دوسری ماں سے زیادہ کرتی تھیں لیکن دو باتوں میں بہت سخت تھیں ایک تو نماز کے بارے میں مطلق تساہل نہیں برتتی تھیں، میں عشا کی نماز پڑھے بغیر کبھی سو گیا، خواہ کیسی ہی گہری نیند ہو اٹھا کر نماز پڑھواتیں اور نماز پڑھے بغیر ہرگز سونے نہ دیتیں، اسی طرح فجر کی نماز کے وقت جگا دیتیں اور مسجد بھیجتیں اور پھر قرآنِ مجید کی تلاوت کے لیے بٹھا دیتیں۔ دوسری بات جس میں وہ قطعاً رعایت نہ کرتیں اور اس میں ان کی غیر معمولی محبت و شفقت حارج نہ ہوتی، یہ تھا کہ اگر میں خادم کے لڑکے یا کام کاج کرنے والے غریب بچوں کے ساتھ کوئی زیادتی، ناانصافی کرتا یا حقارت اور غرور کے ساتھ پیش آتا تو وہ نہ صرف مجھ سے معافی منگواتیں بلکہ ہاتھ تک جڑواتیں۔ اس میں مجھے کتنی ہی اپنی ذلت اور خفت محسوس ہوتی مگر وہ اس کے بغیر نہ مانتیں۔ اس کا مجھے اپنی زندگی میں بہت فائدہ پہنچا اور ظلم و تکبر و غرور سے ڈر معلوم ہونے لگا اور دل آزاری اور دوسروں کی تذلیل کو کبیرہ گناہ سمجھنے لگا۔ اس کی وجہ سے مجھے اپنی غلطی کا اقرار کر لینا ہمیشہ آسان معلوم ہوا۔'' (کاروانِ زندگی، ص ۸۱)

علی میاں کے اپنے الفاظ ہیں کہ ایک موقع پر انھیں انگریزی پڑھنے کا دورہ پڑا۔ ان کے انگریزی میں غیر معمولی اور غیر متوازن انہماک کا علم ان کی والدہ صاحبہ کو ہوا —— والدہ صاحبہ انگریزی زبان اور علمِ دین کا فرق بہت اچھی طرح سمجھتی تھیں —— تو انھوں نے علی میاں کو خط لکھا:

''علی، تم کسی کے کہنے میں نہ آؤ، اگر خدا کی رضامندی حاصل کرنا چاہتے ہو اور میرے حقوق ادا کرنا چاہتے ہو تو ان مردوں پر نظر کرو جنھوں نے علمِ دین حاصل کرنے میں عمر گزار دی، ان کے مرتبے کیا تھے، شاہ ولی اللہ صاحب، شاہ عبد العزیز صاحب، شاہ عبد القادر صاحب، مولوی محمد ابراہیم صاحب اور تمھارے بزرگوں میں خواجہ احمد صاحب اور مولوی محمد امین صاحب جن کی زندگی اور موت اس وقت قابلِ رشک ہوئی کس شان و

شوکت کے ساتھ دنیا برتی اور کیسی کیسی خوبیوں کے ساتھ رحلت فرمائی، یہ مرتبے کیسے حاصل ہو سکتے ہیں، انگریزی مرتبے والے تمھارے خاندان میں بہت ہیں اور ہوں گے، مگر اس مرتبہ کا کوئی نہیں..... علی، اگر میرے سو (۱۰۰) اولادیں ہوتیں تو میں یہی تعلیم دیتی، اب تم ہی ہو، اللہ تعالیٰ میری خوش نیتی کا پھل دے کہ سو (۱۰۰) کی خوبیاں تم سے حاصل ہوں اور میں دارین میں سرخ رو اور نیک نام ہوں اور صاحبِ اولاد کہلاؤں، آمین ثم آمین یارب العالمین۔'' (کاروانِ زندگی، ص ۱۲۲-۱۲۳)

علی میاں کو انگریزی زبان میں مناسب استعداد حاصل ہو چکی تھی۔ چنانچہ انھوں نے لکھا:

''والدہ صاحبہ کی دعاے نیم شبی اور آہ سحر گاہی کا اثر تھا کہ میرا دل اچانک انگریزی کی مزید تعلیم سے اچاٹ ہو گیا اور میں نے کورس کی ساری کتابیں زبردستی لوگوں کے گلے لگائیں۔'' (کاروانِ زندگی، ص ۱۲۳)

سید رضوان علی ندوی کا علی میاں کے ساتھ تعلق ۵۳ سال پر محیط ہے۔ یہ تعلق ۱۹۴۷ء سے قائم ہوا اور علی میاں کی وفات تک کسی نہ کسی صورت میں قائم رہا۔ رضوان علی صاحب علی میاں کی زندگی کے تصنیفی، عملی اور درویشانہ پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مولانا مرحوم کی اپنی تصنیفی زندگی کا آغاز سولہ سال کی عمر میں ہوا جب آپ نے سید احمد شہید رحمہ اللہ پر عربی میں ایک مقالہ لکھا اور یہ مقالہ کتابی شکل میں مصر میں چھپا اور وہاں کے علمانے اس کی داد دی۔ مولانا مرحوم کی پہلی اردو کتاب ''سیرت سید احمد شہید'' ۱۹۳۹ء میں چھپی جب آپ کی عمر صرف ۲۵ برس تھی اور اس نے ملک کے مشہور علما و بزرگانِ دین سے خراجِ تحسین حاصل کیا جن میں مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا حسین احمد مدنی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں اس کے بعد سے تو مولانا مرحوم کے قلم سے تصانیف کا ایک سیلِ رواں تھا جو زندگی کے آخری ایام تک موجیں مارتا رہا۔

آپ کی زندگی کے علمی و عملی و روحانی پہلو اتنے متنوع اور کثیر تعداد میں ہیں کہ ایک دو مضمونوں میں ان کا ذکر کرنا ممکن نہیں ہے۔ ان کی زندگی میں ان پر اردو و عربی میں متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں اور آیندہ لکھی جائیں گی۔ مولانا محشاد علی قاسمی کی کتاب ''مولانا ابوالحسن علی ندوی —— مشاہیر امت کی نظر میں'' طبع ہو چکی ہے اور اسی طرح گزشتہ سال دمشق سے عربی زبان میں ایک نوجوان ہندوستانی مصنف عبدالماجد الغوری الندوی کی ''ابوالحسن علی الحسنی الندوی، الامام المفکر والداعیہ الادیب'' چھپی ہے، تازہ ترین کتاب مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی کے قلم سے ''میرِ کارواں'' ہے، جس میں مولانا مرحوم کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے ..... مولانا کی تصنیفات کی تعداد ۱۷۶ ہے۔ ایک نوجوان ندوی مصنف طارق زبیری نے مولانا کی ایک فہرست گزشتہ سال (۱۹۹۸ء) میں شائع کی ہے جس میں یہ تعداد و تفصیل مذکور ہے۔ (روزنامہ ''جنگ'' میں ۸۰ تصنیفات کی بات غلط ہے۔)

مولانا کی مشہور ترین تصنیف وہ ہے جو آپ نے ۱۹۴۷ء میں عربی زبان میں لکھی تھی۔ یعنی ''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین''، اس کا اردو ترجمہ ''مسلمانوں کے تنزل سے دنیا کو کیا نقصان پہنچا''، عربی اصل سے قبل چھپ چکا تھا جو مولانا مرحوم ہی کے قلم سے تھا۔ اصلی عربی کتاب مصر کے ایک مشہور علمی ادارے ''لجنتہ التالیف والترجمہ والنشر'' کی طرف سے ۱۹۵۰ء میں چھپی اور اس نے سارے عالمِ عرب سے خراجِ تحسین حاصل کیا۔ بہت سے عرب مصنفین کے بقول ۲۰ ویں صدی کی یہ سب سے زائد چھپنے والی عربی کتاب ہے۔ ''میرِ کارواں'' کے مصنف کے بقول اب تک اس کے ۷۰ قانونی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ غیر قانونی اس کے علاوہ ہیں۔ یہ کتاب مولانا مرحوم کے بقول مصر، شام و سوڈان کے پہلے سفر میں ان کا وزٹنگ کارڈ تھا۔ مولانا کی دیگر تصانیف کی طرح یہ کتاب بہت سے ممالک کی عرب یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل ہے۔ اس کا انگریزی، فارسی، ترکی، انڈونیشی زبانوں میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔ انگریزی ترجمہ کا نام ''اسلام اینڈ دی ورلڈ'' ہے۔ حقیقت ہے کہ یہ تاریخ ساز کتاب ہے۔

مولانا کی دوسری انتہائی اہم اور حوالہ (ریفرنس) کی کتاب اردو میں ''تاریخِ دعوت و عزیمت'' ہے جو سات جلدوں میں اور چھ اجزا میں لکھنو و کراچی سے شائع ہوئی ہے اور برابر چھپ رہی ہے۔ اس میں مولانا مرحوم نے عالمِ اسلام کی ان ہستیوں کا ذکر کیا ہے جنھوں نے ہر دور میں اسلام کی خدمت اور اس کے پیغام کو تازہ کرنے کا کام انجام دیا۔ یہ عمر بن عبدالعزیز سے لے کر سید احمد شہید رحمہ اللہ پر ختم ہوتی ہے۔ اس آخری جزو کی دو جلدیں ہیں یہ عربی زبان میں بھی چار جلدوں میں دمشق سے شائع ہو چکی ہے۔ مولانا مرحوم نے اپنی تصنیفات میں تحقیق و جستجو کا وہ معیار قائم رکھا ہے جس کی بنا شبلی و سلیمان ندوی نے ڈالی تھی بلکہ عصری تقاضوں کے مطابق اس کو کچھ مزید ترقی دی ہے۔ مولانا مرحوم نے اپنے زمانے اور ماقبل کے بہت سے بزرگوں کی سوانح عمریاں بھی لکھی ہیں جن میں ''تذکرہ مولانا فضل گنج مراد آبادی''، ''سوانح حضرت عبدالقادر رائے پوری''، ''مولانا الیاس احمد اور ان کی دینی دعوت''، ''سوانح مولانا محمد یعقوب'' وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

آپ کی کتاب ارکان اربعتہ (نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ) بھی اپنے موضوع پر منفرد کتاب ہے اس کا بھی عربی

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ترجمہ ہو چکا ہے۔ پرانے چراغ (تین جلدیں) ان لوگوں کے سوانحی خاکے ہیں، جن کو مولانا نے دیکھا اور جن سے رفاقت رہی۔ تاریخ کے علاوہ یہ ادب کی انتہائی معیاری کتاب ہے۔ مولانا مرحوم کی عربی نثر کی دل آویزی اور اثر انگیزی کے سارے عرب ادیب معترف ہیں۔ اور اسی طرح اردو نثر کے معترف آل احمد سرور اور مرحوم ڈاکٹر ابواللیث جیسی شخصیات رہی ہیں۔

مولانا نے یورپ، امریکہ اور عالمِ عرب کے سفر نامے بھی خاصے کی چیز ہیں۔ آخر میں مولانا نے خود آپ بیتی کا سلسلہ ''کاروانِ زندگی'' کے نام سے شروع کیا تھا جس کی سات جلدیں چھپ چکی ہیں۔ وفات سے ماہ ڈیڑھ ماہ قبل مولانا مرحوم نے مجھے ساتویں جلد کی اشاعت کی خبر دی تھی۔ مجلسِ نشریاتِ اسلام کا ادارہ جس نے مولانا مرحوم کی بیشتر اردو کتابیں شائع کیں ''کاروانِ زندگی'' کی چھ جلدیں شائع کر چکا ہے۔

مولانا مرحوم کی آپ بیتی صرف اپنی ذات کی داستان نہیں بلکہ یہ عالمِ عرب، ہندوستان، یورپ و امریکہ اور خاص کر پورے عالمِ اسلام اور مسلمانانِ عالم کی داستان ہے۔ ہندوستان کے اسلامی مؤرخ کے لیے تو اس میں بے انتہا علمی سرمایہ ہے..... مولانا عالمِ اسلام کی تنظیموں کے رکنِ اساسی یا ممبر تھے۔ آپ رابطہ عالمِ اسلامی، مسلم ورلڈ لیگ، مکہ و مدینہ اسلامک یونیورسٹی کے فاؤنڈر ممبر تھے۔ اسی طرح دمشق کی عرب اکیڈمی، اسلامی انٹرنیشنل یونیورسٹی اسلام آباد فقہ اکیڈمی جدہ وغیرہ۔ آپ کا یورپ میں اہم کارنامہ آکسفورڈ یونیورسٹی میں اسلامی ریسرچ سینٹر قائم کرانا تھا جو ۱۴ سال قبل بعض عرب شخصیات اور یونیورسٹی کے تعاون سے قائم ہوا اور جس کے مولانا چیئرمین رہے۔ اسی طرح آپ نے رابطۂ ادبِ اسلامی قائم کیا جس کے جلسے ترکی، اردن، پاکستان وغیرہ میں ہوتے رہے۔ (ہفت روزہ ''تکبیر'' کراچی، ۱۲ جنوری ۲۰۰۰ء ص ۲۳)

اب آخر میں علی میاں کی تقریروں اور تحریروں سے چند اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں۔ ان اقتباسات سے علی میاں کے طرزِ فکر اور اسلوبِ بیان سے آگاہی حاصل ہو گی۔

''انسانیت کے مسائل اور مشکلات کا حل نہ لباس کی یکسانی ہے، نہ زبان اور تہذیب کا اشتراک، نہ ملک و وطن کی وحدت، نہ علم و دولت، نہ تہذیب و تنظیم، نہ وسائل و ذرائع کی کثرت، ان سب میں کوئی ایک بھی ایسی طاقت نہیں جو دنیا کو بدل دے، جب تک دل کی دنیا نہیں بدلتی، باہر کی دنیا نہیں بدل سکتی، پوری دنیا کی باگ ڈور دل کے ہاتھ ہے، زندگی کا سارا بگاڑ دل کے بگاڑ سے شروع ہوا ہے، لوگ کہتے ہیں کہ مچھلی سر کی طرف سے سڑنا شروع ہوتی ہے، میں کہتا ہوں انسان دل کی طرف سے سڑتا ہے، یہاں سے بگاڑ شروع ہوتا

ہے اور ساری زندگی میں پھیل جاتا ہے۔..... پیغمبر یہیں سے اپنا کام شروع کرتے ہیں وہ خوب سمجھتے ہیں کہ یہ سب دل کا قصور ہے، انسان کا دل بگڑ گیا ہے، اس کے اندر چوری، ظلم، دغا بازی کا جذبہ اور ہوس پیدا ہو گئی ہے، اس کے اندر خواہش کا عفریت ہے جو ہر وقت اس کو نچا رہا ہے، اور وہ بچے کی طرح اس کے اشارے پر حرکت کر رہا ہے پیغمبر کہتے ہیں کہ ساری خرابیوں کی جڑ یہ ہے کہ انسان پاپی ہو گیا ہے، اس کے اندر برائی کا جذبہ اور اس کا زبردست میلان پیدا ہو گیا ہے اس لیے سب سے ضروری اور مقدم کام یہ ہے کہ اس کے دل کی اصلاح کی جائے اور اس کے من کو مانجھا جائے۔'' (تعمیرِ انسانیت، ص۹-۲۰)

''پیغمبر انسان کے اندر تبدیلی پیدا کرتے ہیں، وہ نظام بدلنے کی اتنی کوشش نہیں کرتے، جتنا مزاج بدلنے کی کوشش کرتے ہیں، نظام ہمیشہ مزاج کے تابع رہا ہے، اگر دل نہیں بدلتا، مزاج نہیں بدلتا تو کچھ نہیں بدلتا، لوگ کہتے ہیں کہ دنیا خراب ہے، زمانہ خراب ہے، میں کہتا ہوں یہ کچھ نہیں، بلکہ انسان خراب ہے، کیا زمین کی حالت میں فرق پڑ گیا، کیا ہوا کا اثر بدل گیا، کیا سورج نے گرمی اور روشنی دینی چھوڑ دی کیا آسمان کی حالت تبدیل ہو گئی ..... پیغمبر دلوں میں انجیکشن لگاتے ہیں، لوگ باہر کی ٹیپ ٹاپ کرتے ہیں اور اسی پر سارا زور صرف کرتے ہیں، پیغمبر اندر کے گھن کی فکر کرتے ہیں، آج ساری دنیا میں یہی ہو رہا ہے، انسانیت کا درخت اندر سے خشک ہوتا چلا جا رہا ہے، کیڑا اس کے گودے کو کھائے چلا جا رہا ہے، لیکن زمانہ کے بقراط اوپر سے پانی چھڑکوا رہے ہیں، درخت کے اندر کی سرسبزی اور اس کی نشو و نما کی جو قوت تھی، وہ ختم ہو چلی ہے، لیکن پتیوں کو سرسبز کرنے کو ہوائیں (Gases) پہنچائی جا رہی ہیں، پانی چھڑکا جا رہا ہے کہ خشک پتے ہرے ہوں، پیغمبروں نے انسان کو انسان بنانے کی کوشش کی، انھوں نے اسے ایمانی انجیکشن دیا اور کہا کہ اے بھولے ہوئے انسان اپنے پیدا کرنے والے کو پہچان اور سوتے جاگتے، چلتے پھرتے اسے نگراں مان 'لا تاخذہ سنۃ ولا نوم' نہ اس پر اونگھ کا غلبہ ہوتا ہے و نہ اسے نیند آتی ہے۔'' (تعمیرِ انسانیت، ص۲۳-۲۴)

''آپ سے پہلے جو قومیں دنیا میں تباہ ہوئیں ان پر کسی مرض یا وبا سے تباہی نہیں آئی بلکہ وہ اپنے اخلاق کی خرابی، دولت پرستی اور کریکٹر کی گراوٹ سے تباہ ہوئیں، سیاسی پارٹیاں چاہے جو مرض اور بیماری بتلائیں مگر میں تو یہی کہتا ہوں کہ اصل بیماری انسانیت کی تباہی اور اخلاقی پستی ہے۔'' (تعمیرِ انسانیت، ص۲۶)

''میں چیلنج کرتا ہوں کہ کوئی ماہر اقتصادیات یہ ثابت کرے کہ جتنی پیداوار ہے اس سے زیادہ آبادی ہے، کیونکہ اللہ نے جس انسان کو پیدا کیا ہے، اس کا رزق بھی پیدا کیا ہے، مگر آج انسان کی ہوس اتنی بڑھ چکی ہے کہ

وہ چاہے ایک سیر نہ کھا سکے، مگر اپنے پاس ایک من دیکھنا چاہتا ہے۔ یہ آنکھوں کی ہوس کبھی پوری نہیں ہو سکتی۔ آج فرضی ضرورتوں کی فہرست اتنی طویل ہو چکی ہے کہ جس کی تکمیل کبھی ہو ہی نہیں سکتی۔''

(تعمیرِ انسانیت، ص ۶۲-۶۳)

''انسانی ضروریات کی فہرست بہت لانبی نہیں، فضولیات (Luxuries) کی فہرست بہت لانبی ہے، سب نے اپنی بنیاد 'Luxuries' پر رکھی ہے، زندگی کے تعیش کو مقصود بنالو۔ معدہ اور نفس کو معبود مان لو، خدا کو نہ مانو، اس کی بالادستی کا انکار کرو، انسانوں کو ایک ترقی یافتہ جانور تسلیم کرو اور اس کی زیادہ سے زیادہ خواہشات کو پورا کرو، یہ سب اسی کا فساد ہے، جب تک یہ بنیاد باقی ہے ہزار کوششوں کے باوجود سدھارنا ممکن ہے، کسی شہر اور ملک کی تو کیا ایک میونسپلٹی کے رقبہ کی بھی اصلاح نہیں ہو گی۔'' (تعمیرِ انسانیت، ص ۷۴-۷۵)

''انسانیت تہذیبوں سے بالاتر ہے، یہ سب تہذیبیں مل کر بھی آدمیت کو جنم نہیں دیتیں، آدمیت تہذیبوں کو جنم دیتی ہے، آدمیت کسی مخصوص زمانے اور کسی مخصوص مقام سے مخصوص نہیں۔ تہذیبیں اس کا لباس ہیں اور اپنا لباس بدلتی رہتی ہے اور اپنے سن اور اپنے ذوق کے مطابق اپنے کو آراستہ کرتی رہتی ہے اور یہ بالکل قدرتی اور ضروری ہے۔ جو بچہ ہے وہ بچوں کا لباس پہنے گا، جو جوان ہے وہ جوانوں کا چولا پہنے گا، بچوں کا لباس جوان کو نہیں پہنایا جا سکتا۔ انسانیت کو کسی خاص دور یا کسی خاص ملک کے کلچر کا پابند نہ کیجیے۔ انسانیت کو بڑھنے دیجیے۔ انسانیت آبِ حیات کا چشمہ ہے اسے ابلنے دیجیے، یہ صحرا، ریگستان اور میدانوں میں دوڑنا چاہتا ہے، اسے بڑھنے اور پھیلنے دیجیے۔ مذہب کے عالم گیر اور زندہ اصولوں اور اپنی ذہانت اور ذوق سے انسانیت کا ایک نمونہ اور ایک نیا پیکر پیدا کیجیے۔ انسانیت کا اخلاق کا ایک نیا گلدستہ بنائیے وہ تازہ اور شاداب گلدستہ ہو گا، جو پھول سوکھ گئے، مرجھا گئے ان کو گلے کا ہار بنانے پر اصرار نہ کیجیے۔

مذہب اور تہذیب کا راستہ الگ ہے، مذہب روح دیتا ہے اور کلچر ایک ڈھانچہ (Modle)۔ مذہب طریقۂ حیات اور زندگی کا ایک ضابطہ دیتا ہے، کچھ پابندیاں عائد کرتا ہے، پھر آزاد چھوڑ دیتا ہے، مثال کے طور پر تہذیب کہتی ہے کہ سیٹھے کا قلم مقدس ہے اور مذہب کو اس سے بحث نہیں کہ لوہے کے قلم سے لکھا جائے یا فونٹن پن سے۔ اس کا مطالبہ صرف یہ ہے کہ جو کچھ لکھا جائے وہ سچ ہو اور اچھا، مذہب مقصدِ حیات عطا کرتا ہے اور زندگی کو روح دیتا ہے، وہ انسانی زندگی پر کنٹرول قائم رکھتا ہے مگر اس سے حرکت اور نشو و نما کی صلاحیت نہیں چھینتا کلچر کا احیا انسان کی نجات نہیں، چاہے یہ کام ہندو کرے یا مسلمان یا عیسائی۔'' (تعمیرِ انسانیت، ص ۸۴-۸۵)

''پیغمبروں کا کام یہ نہیں کہ اپنے اپنے زمانہ میں نئی نئی ایجادیں کریں اور آلات اور مشینیں تیار کریں، وہ اس طرح کہ انسان پیدا کرتے ہیں جو ان مصنوعات اور وسائل کو صحیح مقصد کے لیے صحیح طریقے پر استعمال کر سکیں، یورپ وسائل پیدا کرتا ہے، پیغمبر مقاصد عطا کرتے ہیں، انھوں نے مشینیں نہیں ڈھالیں، آدمی ڈھالے تھے، یورپ نے مشینیں بنائیں مگر انھیں استعمال کون کرے؟ درندہ صفت انسان؟ آج ساری مصیبت یہ ہے کہ وسائل بہت ہیں، ایجادات بہت ہیں، سامان بہت ہے مگر صحیح طریقے پر استعمال کرنے والا آدمی نایاب ہے۔''

(تعمیرِ انسانیت، ص۸۶)

''یورپ اور امریکہ کے بڑے بڑے مفکر اب اس کا اعتراف کرنے لگے ہیں کہ تہذیبِ جدید نے وسائل پیدا کیے مگر مقاصد نہیں دیے، وسائل بغیر مقاصد کے بے کار ہیں ہم ایشیا کے رہنے والے یورپ سے کہہ سکتے ہیں کہ تمھارے وسائل اور تمھاری ترقیاں اور تمھارے انکشافات ناقص ہیں۔ سو ذریعے ایک مقصد کی بھی خانہ پری نہیں کر سکتے، تمھاری تہذیب، تمھارا فلسفۂ زندگی، تمھاری ترقیاں، اچھے مقاصد اور نیک خواہشات پیدا کرنے سے قاصر ہیں، تم یہ تو کر سکتے ہو کہ اچھے سے اچھے کام کے ذرائع پیدا کر دو مگر اچھے کام کرنے کا رجحان پیدا نہیں کر سکتے۔ رجحان کا تعلق دل سے ہے اور تمھارے وسائل اور تمھاری ایجادات کی وہاں تک رسائی نہیں اور جب تک اچھے کام کا رجحان نہ ہو، ذرائع اور کام کے امکانات کچھ نہیں کر سکتے۔ اچھے کام کا رجحان اور اس کا شدید تقاضا پیدا کرنا پیغمبروں کا کام تھا اور ان کی تعلیم اب بھی اس کا واحد ذریعہ ہے، انھوں نے بہت بڑے پیمانہ پر اس کو پیدا کر کے دکھادیا، لاکھوں انسانوں کے دل میں نیک کام کی خواہش، خدمت کا جذبہ، ظلم اور بدی کی نفرت پیدا کر دی اور انھوں نے اپنے محدود ذرائع سے وہ کام کر کے دکھادیے جو آج وسیع ذرائع سے نہیں ہو رہے ہیں۔'' (تعمیرِ انسانیت، ص۱۲۴-۱۲۵)

''اہلِ نظر جانتے ہیں کہ انسانی وجود کی طرح نظامِ تعلیم بھی اپنی ایک روح اور ضمیر رکھتا ہے، یہ روح اور ضمیر دراصل اس کے واضعین و مرتبین کے عقائد و نفسیات، زندگی کے متعلق ان کے نقطۂ نظر مطالعۂ کائنات و ''علمِ اسما'' کی اساس و مقصد اور ان کے اخلاق کا عکس اور پرتو ہوتا ہے، جو اس نظام کو ایک مستقل شخصیت، ایک مستقل روح اور ضمیر عطا کرتا ہے..... یہی معاملہ مغربی نظامِ تعلیم کا ہے وہ اپنی ایک روح اور اپنا ایک منفرد ضمیر رکھتا ہے، جو اپنے مصنفین و مرتبین کے عقیدہ و ذہنیت کا عکس، ہزاروں سال کے طبعی ارتقا کا نتیجہ، اہلِ مغرب کے مسلمہ افکار و اقدار کا مجموعہ اور ان کی تعبیر ہے، یہ نظامِ تعلیم جب کسی اسلامی ملک یا مسلمان



www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

سوسائٹی میں نافذ کیا جائے گا تو اس سے ابتداً ذہنی کش مکش، پھر اعتقادی تزلزل، پھر ذہنی اور بعد میں (الا ماشاءاللہ) دینی ارتداد قدرتی ہے ..... اقبال ان معدودے چند خوش قسمت افراد میں سے ہیں جو مغربی نظامِ تعلیم کے سمندر میں غوطہ لگا کر ابھر آئے اور نہ صرف یہ کہ صحیح سلامت ساحل پر پہنچے بلکہ اپنے ساتھ بہت سے موتی تہ سے نکال کر لائے اور ان کی خود اعتمادی، اسلام کی ابدیت اور اس کے وسیع مضمرات پر ان کا یقین اور زیادہ مستحکم ہو گیا، اگرچہ یہ کہنا مشکل ہے کہ انھوں نے مغربی تعلیم اور مغربی فلسفہ کا مطلق اثر قبول نہیں کیا اور ان کا دینی فہم کتاب و سنت اور سلفِ امت کے بالکل مطابق ہے۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اس ''آتشِ نمرود'' نے ان کے ہزاروں معاصرین کی طرح ان کی خودی اور شخصیت کو جلا کر خاک نہیں کیا۔''

(مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کش مکش، ص ۲۴۲-۲۴۸)

''موجودہ عالم اسلام کے رہنما و حکمران طبقہ کے (جس نے عام طور پر اعلیٰ مغربی تعلیم گاہوں میں تعلیم پائی ہے یا مغربی زبانوں میں اسلامی لٹریچر کا مطالعہ کیا ہے) دماغوں میں اسلام کے ماضی کی طرف سے بدگمانی، اس کے حال کی طرف سے بیزاری، اس کے مستقبل کی طرف سے مایوسی، اسلام و پیغمبرِ اسلام اور اسلامی مآخذ (Sources) کے بارہ میں شکوک و شبہات پیدا کرنے اور ''اصلاحِ مذہب''، ''اصلاحِ قانونِ اسلامی'' کے اس طرز پر آمادہ کرنے میں بہت بڑا حصہ ان علماے مغرب کا ہے، جنھوں نے اسلامیات کے مطالعہ کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دی ہیں اور ان کو عام طور پر مستشرقین (Orientalist) کہا جاتا ہے اور جو اپنے علمی تبحر، تحقیقی انہماک اور مشرقیات سے گہری واقفیت کی بنا پر مغرب و مشرق کے علمی و سیاسی حلقوں میں بڑی عظمت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں اور ان مشرقی اسلامی مباحث و مسائل میں ان کی تحقیق و نظریات کو حرفِ آخر اور قولِ فیصل سمجھا جاتا ہے۔

اس استشراق کی تاریخ بہت پرانی ہے، وہ واضح طریقہ پر تیرھویں صدی مسیح سے شروع ہو جاتی ہے، اس کے محرکات دینی بھی تھے، سیاسی بھی، اقتصادی بھی، دینی محرک واضح ہے اس کا بڑا مقصد مذہبِ عیسوی کی اشاعت و تبلیغ اور اسلام کی ایسی تصویر پیش کرنا ہے کہ مسیحیت کی برتری اور ترجیح خود بخود ثابت ہو اور نئے تعلیم یافتہ اصحاب اور نئی نسل کے لیے مسیحیت میں کشش پیدا ہو۔ چنانچہ اکثر استشراق اور تبلیغِ مسیحیت ساتھ ساتھ چلتے ہیں، مستشرقین کی بڑی تعداد اصلاً پادری ہے، ان میں سے ایک بڑی تعداد نسلاً و مذہباً یہودی ہے۔'' (مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کش مکش، ص ۲۵۵-۲۵۶)

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

''جہاں تک مغرب کا تعلق ہے، وہ عالمِ اسلام کے بارے میں کبھی مخلص اور نیک نیت نہیں ہو سکتا یہ اس پچھلی تاریخ کا بھی تقاضا ہے جس پر صلیبی جنگوں کے گھنے سائے پھیلے ہوئے ہیں اور سلطنتِ عثمانیہ اور مغربی ممالک کی طویل اور خوں ریز آویزش کی گہری چھاپ پڑی ہوئی ہے۔ یہ حقیقت پسندی اور عقلِ عملی کا بھی تقاضا ہے کہ صرف عالمِ اسلام ہی میں مغرب کے عالم گیر اقتدار کو چیلنج کرنے اور ایک ایسا نیا بلاک بننے کی صلاحیت پائی جاتی ہے جس کی بنیاد جداگانہ فلسفۂ زندگی اور عالم گیر دعوت پر ہو، یہ ان قدرتی وسائل اور ذخائر کی قدر و قیمت کے احساس کا بھی نتیجہ ہے جو عالمِ اسلام کے مختلف گوشوں میں بڑی افراط اور فراوانی کے ساتھ پائے جاتے ہیں اور جو مغرب کے صنعتی و تجارتی، نیز سیاسی اقتدار کے لیے بڑی اہمیت اور بعض اوقات فیصلہ کن حیثیت رکھتے ہیں ..... اس وقت جتنی تہذیبیں یا قیادتیں ہیں یا مغربی تہذیب کی لکیر کی فقیر اور اس کی ایک روکھی پھیکی تصویر ہیں یا اتنی کمزور اور شکست خوردہ ہیں کہ اس سے آنکھیں نہیں ملا سکتیں۔ اب اگر اسلامی ممالک اور عالمِ اسلام مجموعی طور پر اس خلا کو پر کرنے کی صلاحیت پیدا کر سکے جو مغربی تہذیب کے خاتمہ سے عالمِ انسانی میں پیدا ہو گا تو اس کو دنیا کی امامت کا دوبارہ منصب تفویض کیا جا سکتا ہے ..... اب ان قائدین کو یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ کیا مغرب کی دائمی حاشیہ برداری اور کشکولِ گدائی مناسب ہے یا دنیا کی رہنمائی کا منصبِ عالی اور عالم انسانی کی ہدایت کی مسندِ رفیع۔''

(مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کش مکش، ص ۳۰۸-۳۱۴)

یہ باتیں پڑھ کر یہ احساس شدت اختیار کر لیتا ہے اسلام اور اہلِ اسلام اپنے کتنے بڑے ''سعادت مند خادم'' سے محروم ہو گیا۔ اس عظیم ہستی کے لیے لب دعا گو ہیں کہ :

مثلِ ایوانِ سحر مرقد فروزاں ہو ترا
نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا
آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

## خیال و خامہ

جاوید

اٹھ کہ یہ سلسلۂ شام و سحر تازہ کریں
عالمِ نو ہے، ترے قلب و نظر تازہ کریں

اِس زمانے کو بھی دیں اور زمانہ کوئی
پھر اٹھیں، ولولۂ علم و ہنر تازہ کریں

تیری تدبیر سے نومید ہوئی ہے فطرت
راستے اور بھی ہیں، رختِ سفر تازہ کریں

شعلۂ طور اٹھے آتشِ فاراں ہو کر
پھر تری خاک میں پوشیدہ شرر تازہ کریں

حرف و آہنگ نہ ہوں سوزِ دروں سے خالی
ہر رگِ ساز میں اب خونِ جگر تازہ کریں

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com